ماہنامہ

نعت

لاہور



تحفظِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

ماہنامہ نعت لاہور

جلد ۱۲ — جولائی اگست ۱۹۹۹ — شمارہ ۷، ۸

تحفظِ ناموسِ رسالت

ایڈیٹر: راجا رشید محمود

مشیرِ خصوصی: چوہدری رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ

ڈپٹی ایڈیٹرز: شہناز کوثر، اظہر محمود

مینجر: اختر محمود

قیمت: ۱۵ روپے (عام شمارہ)
۶۰ روپے (اشاعتِ خصوصی)
۲۰۰ روپے (زرِ سالانہ)
عرب ممالک کے لیے: ۱۰۰ ریال

پرنٹر: حاجی محمد نعیم کھوکھر، جیم پرنٹرز۔ لاہور — پبلشر: راجا رشید محمود

کمپیوٹر کمپوزنگ: نعت کمپوزنگ سنٹر — خطاط: منظر رقم

بائنڈر: خلیفہ عبدالمجید، بک بائنڈنگ ہاؤس، ۳۸۔ اردو بازار۔ لاہور

اظہر منزل۔ مسجد سٹریٹ نمبر ۵۔ نیو شالامار کالونی۔ ملتان روڈ
فون ۷۴۶۳۶۸۴ لاہور (پاکستان) پوسٹ کوڈ ۵۴۵۰۰

قیمت اشاعتِ خصوصی: 60 روپے



"نعت" کے عملۂ ادارت کے اعزازات

شہناز کوثر

ان کی کتاب "حضور ﷺ کی مکّی زندگی کے مسلمان" پر ۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ (۲۷ جون ۱۹۹۹) کو اسلام آباد میں ہونے والی "قومی سیرت کانفرنس" میں صدرِ مملکت محمد رفیق تارڑ نے "صدارتی ایوارڈ" دیا۔ جو مبلغ تیس ہزار روپے اور سندِ امتیاز پر مشتمل تھا۔

ماہنامہ "نعت" کی یہ سینئر ڈپٹی ایڈیٹر اس سے پہلے پانچ صدارتی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ آج تک کسی مرد یا خاتون کو چھے صدارتی ایوارڈ نہیں ملے۔

اظہر محمود

○ ۱۔ قومی سیرت کانفرنس میں صدر رفیق تارڑ سے اظہر محمود کو ان کی پنجابی کتاب "سرکار ﷺ دی جنگی زندگی" پر صدارتی ایوارڈ ملا۔ اس سے پہلے ۱۹۹۶ میں اُس وقت کے صدر فاروق احمد خاں لغاری انھیں ایک کتاب "سرکار ﷺ دی سیرت (سال وار)" پر صدارتی ایوارڈ دے چکے ہیں۔

○ ۲۔ ۸ جولائی کو لاہور میں ہونے والی "صوبائی سیرت کانفرنس" میں انھیں "سرکار ﷺ دی جنگی زندگی" پر "سیرت ایوارڈ" ملا۔ انھیں اسنادِ اعزاز کے علاوہ وفاق سے ۱۵ ہزار اور صوبے سے پانچ ہزار روپے بھی ملے۔

راجا رشید محمود

صوبائی سیرت کانفرنس میں نعت کے موضوع پر گرانقدر خدمات انجام دینے پر انھیں بھی "سیرت ایوارڈ" دیا گیا۔

تحفظِ ناموسِ رسالت

رائے محمد کمال

فہرس

نشیب و فراز

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) پر نازل فرمائی اور دینِ اسلام کی نعمت آپ ﷺ پر تمام کر دی۔ قرآنِ مجید فرقانِ حمید وہ مقدس کلام اور دینِ فطرت کا سرچشمۂ نظام ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہہ نہیں۔ سورہ الفاتحہ میں مندرجہ ذیل چند دعائیہ گزارشات بھی موجود ہیں:-

"(اے اللہ) ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے، نہ ان لوگوں کا جو غضب میں مبتلا ہوئے اور نہ گمراہوں کا"۔

سورہ الکھف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"سب تعریف اللہ کے لیئے ہے جس نے اپنے (خاص بندے پر یہ) کتاب نازل فرمائی اور اس میں کسی طرح کا الجھاؤ نہ رکھا"۔

خداوندِ قُدّوس کا صاف حکم موجود ہے کہ قرآن میں ہدایت ہے، ایمان والوں کے لیئے۔ اس کا مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ قرآنِ پاک سے رُشد کی روشنی صرف انہی نفوس کو حاصل ہو سکتی ہے، جن کے دل و دماغ ایمان کے نور سے معمور ہو چکے ہوں۔ بنی نوعِ انسان سے متعلق کتابِ عظیم کے تمام ضابطے قطعی غیر مبہم اور بیّن ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ لوگ مکمل طور پر خالی الذہن ہو کر قرآنِ حکیم سے رجوع نہیں کرتے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ کتابِ ہُدیٰ کے ارشادات کے عین مطابق اپنے عقائد کو ڈھالتے، اعمال کی اصلاح کرتے اور دُنیوی و اُخروی نعمتوں کے مستحق ٹھہرتے۔ لیکن اس کے برخلاف کتابِ مبین کو ذاتی افکار کے سانچے میں ڈھال لیتے اور یوں ترجمہ و تفسیر کا بھی خون کر دیتے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کی روشنی میں ہم بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ

سیدھا راستہ وہ ہے جس پر انعام یافتہ لوگ چلتے ہوں' اور مغضوب لوگوں کی اقتدا محض گمراہی و تباہی ہے۔ اور سب سے بڑی گمراہی و تباہی یہ ہے کہ قرآنی تعبیرات کو مَن چاہی شکل میں سمجھا اور سمجھایا جائے۔

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

جدید دنیائے اسلام میں افکارِ عمیق و لذتِ کردار سے محرومی اور زوالِ تحقیق کے سبب گستاخِ رسول (ﷺ) کی سزا کے بارے میں بھی محکومی و غلامی کے طریق نے فروغ پایا اور اکثر اوقات معذرت خواہانہ انداز اپنایا گیا ہے۔ عقلی و عملی غلاموں کے مسلک میں حکمتِ دین کے تقاضے بھی غلامانہ ہوتے ہیں۔ چونکہ قرآنِ حکیم میں کسی جگہ آدابِ غلامی کا کوئی بیان نہیں آیا' لہٰذا خاکبازوں کے حلقے میں اجتہاد اور خالص دینی نقطۂ نظر کے پردے میں بے عملی و بے غیرتی کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ کہیں تنسیخِ جہاد کا فتویٰ صادر کیا گیا اور کہیں یہ شور و غوغا بلند ہوا کہ اسلام میں فقط دفاعی جنگ کا تصوّر ہی موجود ہے۔ اور اب تو برملا یہ کہا جانے لگا کہ دینِ مبین میں رسول (ﷺ) کی توہین کو سرے سے کوئی قابلِ گرفت جرم قرار نہیں دیا گیا اور نہ ہی اس پر کوئی سزا مقرر ہے۔ میرے خیال میں فتنۂ انکارِ ختمِ نبوّت کے بعد یہ عالمِ اسلام کے خلاف سب سے خطرناک سازش ہے۔ اور اس کا برموقع تدارُک بھی ناگزیر ہے۔ وگرنہ مسلمان ہمیشہ کے لیئے صفحۂ ہستی سے نابود ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ ایک پیچ دار اور گہری سازش ہے۔ اس کے مضمرات میں مسلم دنیا کی ازخود ہلاکت کا پورا سامان موجود ہے۔

یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

نسلی مسلمانوں میں ایک نومولود طبقہ اِسی فکر کا حامل ہے۔ اِس جدّت گزیدہ گروہ کے افراد بالعموم ایک جیسے دلائل و براہین ڈھونڈ لاتے اور غیور و جسور مسلمانوں کے جذبۂ فداکاری و جاں سپاری کو دانستہ یا نادانستہ' شعوری یا لاشعوری طور پر اپنا شکار بناتے ہیں۔ ان کا مؤقف مسطور ہے:

"دعوت' مومن کی شخصیت کی کلید ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی ان کے تمام خارجی روّیہ کو متعیّن کرتا ہے۔ چونکہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دعوت کے شعور کو کھو دیا ہے' اس لیئے ان کا پورا خارجی روّیہ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر ایسی حرکتیں کرتے ہیں' جن کا اسلام سے قطعاً" کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان نہ صرف یہ کہ دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں' بلکہ وہ مسلسل دعوت کو قتل کرنے میں مشغول ہیں۔ دوسری قوموں کو سیاسی حریف سمجھنا' ان کے مقابلہ میں احتجاجی اور مطالباتی مہم چلانا' ایسے جھگڑے کھڑے کرنا جس کے نتیجہ میں داعی اور مدعو کے درمیان تعلقات خراب ہو جائیں۔ اسی طرح کی تمام سرگرمیاں دعوت کی فضا کو بگاڑتی ہیں۔ وہ دعوت و نصیحت کی قاتل ہیں۔ مگر ساری دنیا کے مسلمان ہر روز انہی دعوت کُش سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ اصاغر تو درکنار' ان کے اکابر بھی یہ سوچ نہیں پاتے کہ ایسا کر کے وہ اپنے خلاف' خدا کے غضب کو بھڑکا رہے ہیں۔

انہی دعوت کُش سرگرمیوں میں سے ایک سرگرمی وہ ہے جو "شتمِ رسول ﷺ" کے خلاف مسلمان ہر جگہ جاری کیئے ہوئے ہیں۔ اور جس کا ایک نمایاں مظاہرہ سلمان رُشدی کی کتاب (شیطانی آیات) کی اشاعت کے بعد ۱۹۸۹ دیکھنے میں آیا ہے۔ اینٹی رُشدی ایجی ٹیشن بلاشبہ لغویت کی حد تک غیر اسلامی تھا۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں

کے اصاغر و اکابر کے درمیان اس لیئے جاری رہا کہ دعوتی شعور سے محرومی کی بناء پر انہوں نے وہ کسوٹی کھو دی تھی جس پر جانچ کر وہ معلوم کر سکیں کہ ان کی کون سی روش اسلام کے مطابق ہے، اور کون سی روش اسلام کے مطابق نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اپنے عقیدہ کے اعتبار سے لازم ہے کہ وہ داعی اور مدعو کی اصطلاحوں میں سوچیں۔ وہ اپنی انفرادی اور قومی سرگرمیوں کی تشکیل میں دعوت کو اصل معیار بنائیں۔ وہ دعوت کی مصلحت کو تمام مصلحتوں پر مقدم رکھیں۔ وہ ہر نقصان کو گوارا کر لیں، مگر دعوت کا نقصان کسی قیمت پر گوارا نہ کریں۔ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو یقینی طور پر وہ خدا کے یہاں مجرم قرار پائیں گے ---- ناگوار باتوں پر مشتعل ہو جانے کی اس فہرست میں سب سے زیادہ نمایاں چیز وہ ہے جس کو "ناموسِ رسول (ﷺ) پر حملہ" "رسول (ﷺ) کی شان میں گستاخی" جیسے جذباتی الفاظ میں بیان یا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ لغو مزاج صرف اس لیئے ہے کہ انہوں نے دعوت کا شعور کھو دیا ہے۔ دوسری اقوام کو وہ صرف اپنا قومی رقیب اور دنیوی حریف سمجھتے ہیں۔ اس لیئے ہر بات کو وہ فوراً قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اگر ان کے اندر داعیانہ شعور زندہ ہو تو وہ دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں گے۔ اس کے بعد دوسری اقوام سے انہیں نفرت کے بجائے خیر خواہی پیدا ہو جائے گی۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں پر وہ اسی طرح صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے جیسا کہ رسول (ﷺ) اور اصحابؓ رسول (ﷺ) نے اختیار کیا"۔

مندرجہ بالا تمام گفتگو دراصل داعیانہ مصلحت اور مبلّغانہ حکمت کے نام پر ناموسِ رسالت کے اساسی مسئلہ کو پسِ پُشت ڈالنے کی ناپاک و مذموم جسارت ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اہلِ ایمان کے نازک آبگینوں میں موجزن غیرت و حمیت کے عکسِ کامل کو عمومی جذبہ اور "مسلمانوں کا لغو مزاج" تک کہہ دیا گیا ہے۔ اپنے اپنے ظرف، ذوق

اور مقدر کی بات ہے۔ اقبالؒ نے تو کہا تھا، اور کیا ہی خوب کہا تھا:

مغزِ قرآں، روحِ ایماں، جانِ دیں
ہست حُبِّ رحمۃٌ للعالمیں (ﷺ)

یہ اسلام ہے

مَحبّتِ رسُول (ﷺ) دینِ حق کی شرطِ اوّل اور عقیدہ و ایمان کی اَساس ہے۔ اہانتِ رسُول ایک ناقابلِ معافی جُرم اور ناقابلِ تلافی ظلم ہے۔ قرآن و حدیث، سیرتِ ہادیٔ عالم (ﷺ) اور اُسوۂ صحابہؓ اس پر گواہ ہیں۔ پوری تاریخِ اسلام کے اوراق بھی گواہ ہیں کہ غیور و جسُور مسلمانوں نے اپنے آقا و مولا (ﷺ) کی ذاتِ بابرکات میں ارتکابِ گُستاخی کرنے والوں کو ہمیشہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کے گھاٹ اتارا۔ مگر اس کے باوجود کچھ نام نہاد مُفکّر اور مغرب گزیدہ دانشور ایک عجیب مَوقف رکھتے اور کہتے ہیں: "موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو امتحان کی آزادی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس قسم (توہین) کے واقعات عین اس وقت سے پیش آ رہے ہیں جب کہ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) بہ نفسِ نفیس دنیا میں موجود تھے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ آپ (ﷺ) نے جب عربوں کے سامنے اپنی پیغمبرانہ دعوت پیش کی تو انہوں نے آپ (ﷺ) کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا۔ انہوں نے آپ (ﷺ) کو عملی طور پر ستانے کے علاوہ آپ (ﷺ) پر طرح طرح کے بُرے القاب چسپاں کیئے۔ جب ہم اس اعتبار سے دورِ اول (عہدِ نبوّت و خلافتِ راشدہ) کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی گستاخی کرنے والے غیر مسلموں کے خلاف کبھی بھی اس طرح کی کارروائی نہیں کی گئی، جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یا کر رہے ہوں"۔

معترضین کہتے ہیں کہ ---- "یہ اسلام نہیں" ---- جسے جہاد کہا جا رہا

ہے، وہ درحقیقت سرکشی ہے۔ سیرتِ رسول ﷺ اور اُسوۂ صحابہؓ سے بے نیاز ہو کر موجودہ قسم کی اشتعال انگیز کارروائی (تحریکِ گستاخئ رسول (ﷺ) کے خلاف غم و غصّہ کا اظہار) اپنے نفس کا اتباع ہے نہ کہ خدا اور رسول (ﷺ) کا اتباع۔ گستاخِ رسول ﷺ کی سزا کے مخالفین ملتِ اسلامیہ کو یاد دلاتے ہیں کہ اس قسم کی صورتِ حال میں ہمیں سب سے پہلے قرآن، حدیث اور سیرت کو دیکھ کر معلوم کرنا چاہئیے کہ اس طرح کا کوئی معاملہ جب دورِ اول میں پیش آیا تو خود رسولِ پاک (ﷺ) اور آپ ﷺ کے اصحاب نے اس پر کس قسم کا ردِّ عمل پیش کیا۔ اور پھر وہ وہی کریں جو رسول (ﷺ) اور اصحابِ رسول ﷺ کے نمونہ سے ثابت ہو رہا ہو۔ بقول ان کے، اس طرح کے معاملات میں ہمیں صرف یہ کرنا چاہئیے کہ ایسے لوگوں کے حق میں اصلاح اور ہدایت کی دعا کریں۔ ان سے ملاقات کر کے پُروقار طریقہ سے ان کی غلط فہمی کو دور کریں۔ سنجیدہ اور علمی انداز میں وضاحتی مضامین لکھ کر اخبارات میں شائع کرائیں۔ یہی واحد کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس کے سوا مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں، وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے نہ کہ خدا کی رحمت کو کھینچنے والا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو رحمت بنا کر بھیجا ہے، نہ کہ جلانے اور پھونکنے والا بنا کر۔

روحِ قرآنی کے مطابق، اللہ کے رسول (ﷺ) سے جنگ کرنا ایسا ہے جیسا کہ خود اللہ سے جنگ کرنا۔ بلکہ رسول ﷺ سے جنگ کرنے کو ہی اللہ نے خود اپنے سے جنگ قرار دیا ہے۔ مزید بر آں یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے جنگ کرنے کا نتیجہ، زمین پر فساد کا بپا ہو جانا ہے۔ کیونکہ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا قانون نافذ ہو تو خطۂ ارض، امن کا گہوارہ بن جائے۔ فساد تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب حکمِ خداوندی سے رُوگردانی و حکم عدولی یا بغاوت کا اظہار کیا جائے

گا۔ اِس دائرے میں جو جرم بھی آئے، اس کی سزا معیّن ہے اور وہ "موت" ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں توہینِ رسول (ﷺ) سے بڑا کوئی اور جرم یا ذریعۂ فساد ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاتمِ نبیؐ، کائنات کا سب سے بڑا فتنہ پرور ہے اور اس سنگین جرم کے ارتکاب کی وجہ سے اسے سنگین ترین سزا دی جائے گی اور وہ سزائے قتل ہے۔ رسولُ اللہ (ﷺ) کو انہیں معاف کرنے یا نہ کرنے کا حق حاصل تھا مگر معافی کے حق کا استعمال امّت میں سے کوئی فرد نہیں کر سکتا۔ کئی مواقع پر رسولِ خدا (ﷺ) نے گستاخان و شاتمان کو لقمۂ موت بنانے کا حکم فرمایا تھا اور اس کی بہت سی مثالیں موجود و محفوظ ہیں۔ اصولِ دین یہ ہے کہ اگر امام القبلتین (ﷺ) نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں اہانت کے مرتکب کسی ایک مجرم کو کوئی سزا دی ہوتی تو تب بھی یہ واحد نظیر، امتِ مُسلمہ کے لئے ایک واجب التعمیل قانون کے درجہ پر ہوتی۔ چہ جائیکہ اس معاملے میں کُتُبِ سِیَر و احادیث اور صفحۂ تاریخ پر متعدّد نظائر موجود ہیں۔ یہ وہ واقعات ہیں جن میں توہینِ رسالت کے جرم میں اکثر خود رسالت مآب (ﷺ) کی زبانِ مبارک سے شاتمان کو مستوجبِ قتل قرار دیا گیا۔

○ نضر بن حارث: تاریخی اعتبار سے پہلی نظیر کا باقاعدہ تعلّق، ہجرت کے صرف ایک سال بعد سے ہے، جبکہ غزوۂ بدر کی شکل میں حق و باطل کا ابتدائی معرکہ پیش آیا۔ آقائے نامدار (ﷺ) کو اس رزم گاہِ اوّل میں شاندار فتح نصیب ہوئی تو میدانِ بدر سے مدینۂ طیّبہ لوٹتے ہوئے اس سفر میں وادی صفراء پہنچے تو نضر بن حارث کی گردن مارنے کا حکم فرمایا۔ تعمیلِ ارشاد میں سیّدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

○ عقبہ بن ابی مُعیط: ازاں بعد اسی سفر کے دوران جب عرق الطبیہ کے مقام پر پہنچے

تو اسیرانِ جنگ میں عقبہ بن ابی مُعیط کو تہِ تیغ کر دیا گیا۔ اِسی بدطینت نے ایک بار مکۃُ المکرمہ میں سرورِ کائنات فخرِ موجودات (ﷺ) پر حالتِ نماز میں اونٹ کی اوجھ لا کر ڈال دی تھی۔ نیز ایک اور موقع پر آپ ﷺ کی گردنِ مبارک کے گرد کپڑا کس کر شدید اذیّت پہنچائی تھی۔ اسے بھی آقا و مولا (ﷺ) کا اشارہ پا کر حضرت علی المرتضیٰؓ نے ہی موت کے گھاٹ اتارا۔ اس بارے میں ابنِ خُلدون تک یہ خبر لائے ہیں کہ دونوں قیدی نبیٔ کریم رؤف الرّحیم (ﷺ) سے نہایت دشمنی رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ دیگر قیدیوں کے برعکس انفرادی معاملہ محض اِس لئے کیا گیا کہ یہ تاجدارِ مدینہ (ﷺ) کو مکّی زندگی کے دوران اہانت و ایذاء رسانی کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ وگرنہ دوسرے جنگی قیدیوں کے ساتھ جو حُسنِ سلوک روا رکھا گیا، اس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔ اس بارے میں بعض مزید معلومات و تفصیلات بھی میسر آتی ہیں۔

"عقبہ بن ابی معیط جب کبھی سفر سے واپس آتا تو دعوتِ عام کرتا جس میں اہلِ مکّہ شریک ہوتے۔ یہ اکثر حضور (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ حضور ﷺ کی باتیں سُنتا اور انہیں پسند کرتا۔ ایک دفعہ وہ سفر سے واپس آیا تو اس نے حسبِ دستور دعوتِ عام کا اہتمام کیا اور حضورِ پاک (ﷺ) کو بھی دعوت دی۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا جب تک تو مشرّف باسلام نہ ہو، میں تیری دعوت قبول نہیں کروں گا۔ چنانچہ اس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ ابی بن خلف سے عقبہ کا بڑا یارانہ تھا۔ اس نے سنا تو آ کر کہا۔ "اے عقبہ! سنا ہے تو مرتد ہو گیا ہے"۔ اس نے کہا، ہرگز نہیں۔ میں نے محض ایک غرض کے لئے اسلام کا اظہار کیا ہے۔ ابی کہنے لگا۔ میں تم سے اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا، جب تک تو اس کے پاس جا کر ایسی ایسی گستاخیاں نہ کرے۔ عقبہ اپنے یار کو خوش کرنے کے لئے

حضورِ اقدس ﷺ کے پاس گیا اور وہ ساری گستاخیاں کیں، جن کی فرمائش اس کے یار نے کی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے رُخِ انور پر تھوک دیا۔ (لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی تھوک کو آگ کا انگارہ بنا کر لوٹایا اور اس کے منہ پر دے مارا، جس سے اس کا منہ جل گیا اور مرتے دم تک گالوں پر یہ داغ باقی رہا) حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "جب سرزمینِ مکہ سے باہر تیری میری ملاقات ہو گی تو تیرا سر تلوار سے اڑا دوں گا۔ یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ کئی سال بعد جب اہلِ مکہ بدر کی طرف جانے لگے تو اس نے پہلو تہی کرنا چاہی۔ اور کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ اس شخص نے مجھے دھمکی دی تھی اور جو بات ان کے منہ سے نکلتی ہے، پوری ہو کر رہتی ہے۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ انہوں نے کہا، تم بھی عجیب آدمی ہو، پہلے تو اس کے غالب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرضِ محال کوئی ایسی صورت پیش آ گئی تو تمہارے پاس تیز رفتار سُرخ اونٹ ہے، اس پر سوار ہو جانا۔ چنانچہ اسے اپنے بدبختی لے گئی۔ کفر کو شکست ہوئی۔ یہ اپنے اونٹ کو لے کر بھاگا۔ لیکن وادی کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گیا اور گرفتار ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب عقبہ بن ابی مُعیط قتل کیا جانے لگا تو اس نے پکار کر کہا۔ "قبیلہ قریش کے لوگو! آج میں تمہارے سامنے قتل کیا جا رہا ہوں اور تم خاموش ہو"۔ اس پر رسولُ اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: "تو اپنے کفر اور رسولُ اللہ (ﷺ) پر افتراء پردازی کے باعث قتل ہو رہا ہے۔"

آئندہ برس یعنی ۳ ہجری میں اہانتِ رسول (ﷺ) کے چار مجرموں کو یکے بعد دیگرے قتل کیا گیا۔ روایات میں ہے کہ عصماء نامی ایک یہودی شاعرہ، جو محبوبِ خدا (ﷺ) کی ذاتِ بابرکات کو نشانۂ طنز و تضحیک بناتی اور آپ ﷺ کی ارفع و اعلیٰ شانِ مبارک میں ہجویہ اشعار بکا کرتی تھی۔ ایک صحابی عمرؓ بن عدی (جو نابینا تھے) کے ہاتھوں فنا فی النّار ہوئی۔ اس پر اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے

رسولِ کریم (ﷺ) نے اس صحابی کو بطورِ تحسین و آفرین "بصیر اور بینا" کے القاب و خطاب سے سرفراز فرمایا۔ کتبِ سیرو تواریخ میں اس واقعہ سے متعلق کئی مزید معلومات بھی مرقوم ہیں۔

○ عصماء بنتِ مروان: یہ یزید بن خطمی کی زوجہ 'مذہبا' و 'نسلا' یہودی اور زبان دراز تھی۔ اس کا مشغلہ تھا کہ اسلام اور اہلِ اسلام سے برائیاں منسوب کرتی، تمسخر اڑاتی اور مذمت کرتی رہتی۔ رسول اللہ ﷺ کو برابر اذیت پہنچانا اس کا معمول تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت عُمیر بن عدیؓ کو اس کے قتل کے لئے بھیجا۔ حضرت عمیرؓ رات کے وقت عصماء کے گھر پہنچے، جو مدینہ سے باہر تھا۔ اپنی تلوار اس کے سینے پر رکھ کر پشت سے گزار دی اور لوٹ آئے۔

○ دیگر واقعات: دوسری روایت یوں ہے کہ ایک نابینا صحابی کی لونڈی تھی، جو حضورِ پاک (ﷺ) کی شان و بیان میں بے ادبی و گستاخی کا ارتکاب کرتی۔ ہجو و ہرزہ اور سبّ و شتم میں بے باک تھی۔ نابینا صحابی، اپنی اس لونڈی کو منع کرتے، ڈانٹتے اور جھڑکتے کہ حضور آقا و مولا (ﷺ) کے ناتے خباثتوں سے باز رہے۔ مگر وہ باز نہ آئی۔ ایک روز حسبِ معمول اس نے یاوہ گوئی کی۔ صحابئ رسول (ﷺ) کی غیرت و حمیت یہ معاملہ برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے چھُرا اٹھایا اور اس کے پیٹ میں جھونک دیا۔ صبح بارگاہِ نبوی (ﷺ) میں اس کے قتل کا ذکر ہوا۔ سرورِ ہر جہاں (ﷺ) نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا: "جس شخص نے یہ کام کیا ہے، میں اسے خدا کی قسم دیتا ہوں اور اپنے حق کی جو میرا اس پر ہے وہ کھڑا ہو جائے۔ (یعنی وہ اقرار کرے کہ میں نے یہ کام کیا ہے) یہ سن کر وہی نابینا صحابی کھڑے ہوئے۔ لوگوں کو پھاندتے اور لرزتے ہوئے آئے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ عرض کی یا رسولُ اللہ (ﷺ) میں اس

لونڈی کا قاتل ہوں، کیونکہ وہ آپ ﷺ کو اچھا نہ کہتی اور ہجو کرتی تھی۔ میں اسے منع کرتا لیکن وہ باز نہ آتی۔ جھڑکتا تھا پھر بھی نہ مانتی۔ اس کے بطن سے میرے دو موتیوں جیسے بیٹے ہیں۔ گزشتہ رات وہ آپ ﷺ کی تنقیص و ہجو کرنے لگی تو میں نے چھُرا اس کے پیٹ پر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا۔ "گواہ رہو کہ اس کا خون رائیگاں گیا"۔

سُنن ابی داوٗد اور ترمذی میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے اپنی لونڈی کو جس سے اس کی اولاد بھی تھی، نبیٔ اکرم (ﷺ) کی شانِ اقدس میں اہانت کرتے سنا تو اسے ہلاک کر دیا۔ رسولِ پاک (ﷺ) نے قرار دیا کہ لونڈی کا خون ساقط ہے۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ جو حدِّ الٰہی کے قیام میں مارا گیا، اس کے خون پر نہ تو دِیَت لازم آتی ہے نہ قصاص۔ بلکہ یہ کہ حد کو تعزیر میں بھی نہیں بدلا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ شاتم و گستاخ کا خون رائیگاں ہو گا۔

امام ابنِ تیمیہ مذکورہ حدیث و واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ حدیث، شاتمِ رسول (ﷺ) کے قتل کے جواز پر نص کا درجہ رکھتی ہے"۔ اسی طرح حضرت عمیرؓ بن امیہ نے اپنی ایک بہن کو قتل کر دیا، جو مشرکہ تھی اور آقائے و نامدار (ﷺ) کی شانِ زیبا و اقدس میں بدزبانی کا ارتکاب کرتی تھی۔ رسولِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ اس کا خون ساقط ہے۔

حدیثِ مبارکہ میں ہے: "حضرت علیؓ راوی ہیں کہ ایک یہودیہ، حضورِ اکرم (ﷺ) کی بے ادب و گستاخ تھی اور آپ ﷺ کی شان میں طعن اور ہجو کرتی۔ بایں سبب ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹا، یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ رسولُ اللہ (ﷺ) نے اس کا خون رائیگاں قرار دے دیا"۔

○ غزوۂ احد سے واپسی کے سفر میں ایک شخص ابو عزہ جمحی دکھائی دیا تو خواجۂ کائنات (ﷺ) کے حکم سے حضرت عاصمؓ بن ثابت نے اس کو تہِ تیغ کر دیا، کیونکہ یہ بدکردار و بدگفتار اپنے اشعار کے زور سے رسولِ معظم (ﷺ) کے خلاف لوگوں کے جذبات برانگیختہ کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے جہنم میں پہنچا دیا گیا۔

○ ایک شخص ابی عفک تھا، بوڑھا یہودی تھا۔ اس کی عمر ایک سو بیس سال کو پہنچ چکی تھی۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف لوگوں کو ورغلاتا، اُبھارتا اور ایسے شعر پڑھتا تھا، جن میں لوگوں کے لیئے رسولِ خدا (ﷺ) سے نفرت کی ترغیب ہوتی تھی۔ حضرت سالمؓ بن عُمیرؓ کو اس کے قتل کے لیئے بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنی تلوار اس کے جگر کے نیچے گھونپی اور اسے چیر کر رکھ دیا اور یوں وہ دشمنِ خدا، نیست و نابود ہُوا۔

○ کعب بن اشرف: ایک نہایت مالدار یہودی اور فتنہ پرور شخص تھا (مدینۃ المنورہ کے مضافات میں اس کے قلعہ کے کسی حد تک اب بھی شاید آثار پائے جاتے ہیں (اس کا قلعہ بڑا مضبوط اور شاندار تھا۔ اپنی دولت و ثروت کے گھمنڈ میں یہ انتہائی مکروہ انداز میں، شافعِ محشر ساقیٔ کوثر (ﷺ) کے بارے میں بدکلامی کرتا۔ اس کی بدزبانی ناقابلِ برداشت تھی۔ تاجدارِ مدینہ (ﷺ) کے حکمِ خاص کے تحت ایک صحابی حضرت ابونائلہؓ نے اپنے چند احباب کے ہمراہ قلعہ میں جا کر اس ملیچھ کو موت کی نیند سلا دیا اور یوں اس نامراد دشمن کا خاتمہ ہوا۔ یہ یہودیوں کے ایک مشہور قبیلہ بنو قریظہ کی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس واقعۂ قتل کو عہدِ رسالت میں شاتمان کے تذکرہ کی رعایت سے بوجوہ خاص شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اکثر و بیشتر سیرت نگار اور مورخین اس کی تمام جزئیات و تفصیلات بیان میں لائے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کعب بن اشرف ایک رئیس اور شاعر تھا۔ ہمہ وقت شر انگیزیوں میں مشغول رہتا اور کفارِ مکہ کو جنگ کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ شاہِ کون و مکاں،

نبی آخر الزماں (ﷺ) نے دعا فرمائی۔ "اے اللہ! ہمیں ابنِ اشرف کے شر سے محفوظ رکھ۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ "کون ہے جو کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے لئے تیار ہے؟ اس لیئے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ چنانچہ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ "یا رسولَ اللہ (ﷺ) کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں اسے ہلاک کروں"۔ فرمایا۔ "ہاں"۔ ان کے ساتھ حارثؓ بن اوس بھی گئے۔ انہوں نے اسے قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر اپنے آقا و مولا (ﷺ) کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ المفضل نے اپنی کتاب (معانی القرآن) میں درج کیا ہے کہ محمدؓ بن مسلمہ اور ان کے ساتھی، شاتم مذکور کا سر کاٹ کر ایک ٹوکری میں رکھ کر لائے اور صاحبِ لولاک (ﷺ) کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

دراصل کعب بن اشرف یہودیوں کا سردار تھا، جو حضور پُرنور (ﷺ) کی ہجو کرتا اور آپ ﷺ کے دشمنوں کو ایذا رسانی پر بھڑکاتا تھا۔ جب اس کی شرارت حد سے بڑھ گئی تو ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا: "کون ہے جو رسولِ خدا (ﷺ) کے دشمن کو ٹھکانے لگائے گا"۔ پانچ انصاری کھڑے ہوئے۔ ان میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ بھی تھے۔ محمدؓ بن مسلمہ نے آقا و مولا (ﷺ) سے اس بات کی اجازت لی کہ اگر سیاست و حکمت کے طور پر اس کے سامنے آپ ﷺ کی کچھ شکایت کرنی پڑے تو آپ ﷺ پہلے ہی اسے معاف فرما دیں۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر کعب کے پاس گئے اور کہا: اس نبی (ﷺ) نے ہم پر زکوٰۃ عائد کر کے مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں کچھ قرض دو"۔ ان کی شکایت سے وہ بہت خوش ہوا۔ تاہم اس نے کہا کہ تم اپنی عورتوں یا بچوں میں سے کوئی چیز ہمارے پاس رہن کر دو۔ آخرِ کار

اس پر معاملہ طے ہوا کہ ہتھیار رہن رکھے جائیں گے۔ دوسرے دن انصار اپنے ہتھیار لے کر گئے۔

رات کا وقت تھا۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ اس کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ حضرت ابو نائلہؓ بھی تھے جو کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی بیان کیے جاتے ہیں۔ غرضیکہ مردودِ مذکور نے انہیں اپنے قلعہ میں بلا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ان کی طرف نیچے اترنے لگا تو اس کی بیوی بولی' اس وقت کہاں جاتے ہو؟ میں ایک ایسی آواز سن رہی ہوں کہ گویا اس سے خون ٹپکتا ہے۔ کعب نے کہا' فکر کی کوئی بات نہیں۔ ادھر محمد بن مسلمہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ میں اس کے سر کے بال پکڑ کر سونگھوں گا۔ جب تم دیکھو کہ میں نے اس کا سر مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے تو تم قریب آ کر اسے قتل کر دینا۔ چنانچہ جب یہ گستاخ کپڑا اوڑھے ان کے پاس آیا تو خوشبو مہک رہی تھی۔ محمد بن مسلمہ نے کہا' میں نے آج کے دن کی طرح خوشبو پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔ کیا میں یہ سونگھ سکتا ہوں؟ اس نے کہا' ہاں سونگھ لیجیے۔ وہ دھوکے میں آ گیا تھا اور جب اپنے سر کی خوشگو سونگھانے کے لیئے اس نے سر جھکایا تو محمد بن مسلمہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کا سر قلم کر دیا"۔

علامہ ابنِ خلدون لکھتے ہیں: "کعب بن اشرف' طے کا ایک یہودی تھا۔ اس کی ماں بنو نضیر سے تھی۔ جس وقت سے آپ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تھے' اسی وقت سے اس کو ایک ذاتی خصومت تھی۔ لیکن واقعۂ بدر کے بعد یہ رسولِ اللہ (ﷺ) کے تصوّر و فکر سے اور زیادہ جلنے لگا۔ چنانچہ زیدؓ بن حارثہ یا (عبداللہ بن رواحہؓ) جب مدینہ میں فتحِ بدر کی خوشخبری لے کر آئے اور اس نے بھی سنا تو بے ساختہ یہ کہہ اٹھا۔ "تف ہو تم پر۔ کیا یہ بات سچی ہے۔ قریش تو عرب کے شرفاء اور عوام کے بادشاہ تھے۔ اگر انہیں محمد ﷺ نے ختم کر دیا ہے تو پھر

زندگی سے موت بہتر ہے۔

جب اس کو اس واقعہ کا یقین ہو گیا تو وہ مکہ چلا آیا۔ اور مُطّلب بن ابی وداعہ سہمی کے پاس جا کر اترا (اس کی زوجیت میں عاتکہ بنتِ اُسید بن ابی العیص بن امیہ تھی)۔ ان لوگوں کو رسولِ خدا (ﷺ) کی مخالفت پر ابھارنے لگا۔ اشعار پڑھتا اور مقتولین و مشرکینِ بدر پر روتا تھا۔ چند دنوں کے بعد مدینہ لوٹ آیا۔ پہلے عاتکہ بن اُسید (مکہ میں اس کے میزبان کی اہلیہ) کی نسبت عشقیہ مضامین و اشعار کہے۔ بعد ازاں مسلمانوں کی عورتوں کا اپنی غزلیات و قصائد میں ذکر کرتا اور ان کے ساتھ تشبیب کرنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "کون شخص ہے جو کعب بن اشرف کی گردن مارے؟"۔ محمد بن مسلمہ ابو نائلہ (کعب کے رضاعی بھائی' بنو عبدالاشہل سے) اور کچھ دوسروں نے عرض کیا۔ ہم لوگ اس کو ماریں گے۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو اجازت دی اور ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

تاریخ ابنِ خلدون میں "یہود کا مدینہ میں خوف و ہراس" کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں: "یہودیوں پر اس واقعہ سے خوف طاری ہو گیا۔ ہر یہودی مسلمانوں سے ڈرنے لگا۔ آپ ﷺ نے بھی بالہامِ الٰہی' یہودیوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا' کہ تم لوگ جہاں کہیں یہودیوں پر قابو پاؤ' ان کو قتل کر دو"۔

اہلِ یہود کا تاریخی پس منظر بھی از حد دلچسپ اور لائقِ مطالعہ ہے۔ ہجرت کے بعد جب اللہ کے آخری رسول (ﷺ) مدینۃُ المنوّرہ میں جلوہ افروز ہوئے تو یہاں عملاً" تسلّط یہودیوں کا ہی تھا۔ عرب قبائل میں اوس و خزرج بھی آباد تھے مگر وہ مُدّت ہائے دراز کے باہمی کُشت و خُون کی وجہ سے خاصے کمزور ہو چکے تھے۔

اوراقِ تاریخ بتاتے ہیں کہ خطۂ عرب میں یہودیت کا فروغ پانچویں صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے زمانہ میں ہوا تھا۔ جب اس نے یہودیوں کو نیست و نابود کرنا چاہا

تو یہ یہاں چلے آئے۔ بنو حرث بن کعب، حمیر، کندہ یہودی قبیلے تھے اور یہ کہ خیبر کے لوگ بھی مذہبا" یہودیت میں داخل ہو گئے تھے۔ مگر یثرب میں ان سے بنو قینُقاع، بنو نَضیر اور بنو قُریظہ، اہم یہودی قبائل موجود تھے۔ اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے ہجرت کے بعد ان سے ایک معاہدہ طے فرمایا تھا جو "میثاقِ مدینہ" کے نام سے مشہور ہے۔ الغرض یہ کہ بنو قینُقاع اور بنو نَضیر کو اپنی سازشوں اور وعدہ خلافیوں کے سبب نقلِ مکانی اختیار کرنا پڑی لیکن غزوۃ الاحزاب (غزوۂ خندق) کے موقع پر قریشِ مکہ سے سازباز کی وجہ سے بنو قریظہ کو نقضِ عہد اور سختِ شر کی وجہ سے معافی نہ مل سکی۔

غزوۂ خندق سے فراغت کے بعد رسولِ اکرم (ﷺ) نے صحابۂ کرامؓ کو حکم فرمایا کہ کوئی بھی سوائے بنو قریظہ کے اور کہیں نماز عصر نہ پڑھے۔ ابنِ اسحاق نے یہ بھی لکھا کہ بعض اصحاب جو کسی ضرورت سے باہر چلے گئے تھے، انہوں نے عشاء کے وقت، حکمِ نبوی ﷺ کی تعمیل و اطاعت میں بنو قریظہ میں آ کر نماز پڑھی تھی۔ اور یہ کہ ان کا پچیس یوم تک محاصرہ کیئے رکھا۔ ازاں بعد خود ان کی خواہش پر حضرت سعدؓ بن معاذ کو فیصل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے قرار دیا کہ بنو قریظہ کے کُل مرد قتل کیئے جائیں۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ بے شک تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ دیا۔ للذا بنو قریظہ کے جنگجو افراد، بازارِ مدینہ کی طرف لائے گئے اور خندقیں کھود کر ان کی گردنیں ماری گئیں۔ ان کی تعداد چھ اور سات سو کے درمیان تھی۔

○ **ابو رافع کا قتل:** المختصر یہ کہ اسلام دشمنی اور دریدہ دہنی میں کعب بن اشرف کا ایک یارِ نابکار و مددگار، ابو رافع بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ نہایت امیر تاجر تھا۔ اس کی رہائش ایک محل نما گڑھی میں واقع تھی۔ اسے بھی محبوبِ کردگار سیّدُ الابرار (ﷺ) کی رضا و ایماء سے ایک صحابی، حضرت عبداللہؓ نے موت سے ہمکنار

رکیا۔

ابو رافع عبداللہ بن ابی الحقیق ایک بدفطرت، بدطینت اور بدخصلت شخص تھا۔ بڑا مالدار اور تونگر تھا۔ یہ تاجدارِ حرم (ﷺ) کی شانِ مبارک میں اپنی ناپاک زبان وا کیا کرتا۔ سازشوں میں مصروف رہتا اور معرکۂ حق و باطل میں مشرکوں اور کافروں کا معاون ہوتا تھا۔ اہلِ اسلام کے خلاف اس نے قبیلہ بنی غطفان کی بھرپور معاونت کی تھی۔ لیکن اس کی گستاخی و اہانت کا جُرم بہت بڑھا ہوا تھا۔

حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں: "رسولُ اللہ (ﷺ) نے ابو رافع یہودی کی طرف انصار کے چند آدمی بھیجے۔ عبداللہؓ بن عتیک کو ان کا امیر مقرر کیا۔ ابو رافع، رسولُ اللہ (ﷺ) کو اذیّت پہنچایا کرتا اور آپ ﷺ کے مقابلے میں کفّار کو مدد دیتا تھا"۔

حضرت عبداللہ بن عتیکؓ نے آمنہ کے لال (ﷺ) کے فرمان پر رات کو اس کے قلعہ میں جا کر تلوار کی نوک اس کے پیٹ میں گھونپ دی، جو اس کی پشت سے باہر نکل گئی، یہاں تک کہ ہڈیوں کے ٹوٹنے کی صاف آواز سنائی دی۔ اس کے قتل کا یقین ہو جانے کے بعد حضرت عبداللہؓ بن عتیک نے قلعہ سے چھلانگ لگائی، جس سے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ رفقاء نے سرورِ کونین (ﷺ) کی خدمتِ ناز میں پہنچایا۔ حضورِ اقدس (ﷺ) اُن سے خوش ہوئے اور آپ ﷺ نے ان پر اپنا دستِ مبارک پھیرا، جس سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ اپنی اصل حالت میں آ گئی۔

اس واقعہ کی مزید تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں: "جب عبداللہ بن عتیکؓ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس قلعے کے قریب آئے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ لوگ اپنے مویشی ہانک لائے تھے۔ عبداللہؓ بن عتیک نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم اپنی جگہ

بیٹھے رہو' میں چلتا ہوں۔ چوکیدار سے کوئی حیلہ بہانہ کرتا ہوں' شاید یوں قلعے میں داخل ہو جاؤں۔ وہ آئے اور قلعہ کے دروازے کے قریب بیٹھ گئے۔ گویا رفعِ حاجت کر رہے ہوں۔ جب لوگ قلعہ میں داخل ہو چکے تو دربان نے انہیں آواز دی۔ بندۂ خدا! اگر قلعے میں داخل ہونا ہے تو جلدی اندر آ جاؤ' دروازہ بند ہونے لگا ہے۔ عبداللہؓ بن عتیک کہتے ہیں کہ میں قلعے میں داخل ہو کر رُوپوش ہو گیا۔ جب سب لوگ اوپر آ گئے تو دربان نے دروازہ بند کر کے کنجیاں ایک لوہے کی کیل میں لٹکا دیں۔ میں نے چابیوں تک رسائی حاصل کی اور یوں دروازہ کھول دیا۔ ابو رافع کے پاس رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اپنے بالا خانے میں محوِ استراحت ہو کر حکایات سنا کرتا تھا۔ حسبِ معمول آج جب قصہ گو چلے گئے تو میں نے اس کے بالا خانے کا قصد کیا۔ جب بھی کوئی دروازہ کھولتا' اسے اندر سے اس خیال سے بند کر دیتا کہ اگر لوگوں کو میرا پتا بھی چل جائے تو وہ مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ حتیٰ کہ میں اسے قتل کر دوں۔ یوں میں ابو رافع کے پاس پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے اہل و عیال کے درمیان تاریک کمرے میں سو رہا ہے۔ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس جگہ ہے۔ میں نے آواز دی۔ کہنے لگا کون ہے؟ میں نے اس کی آواز پر آگے بڑھ کر تلوار کی ضرب لگائی۔ درآنحالیکہ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ نہیں ہو سکا اور وار خالی گیا ہے۔ اِس اثنا میں اُس نے چیخ و پکار کی۔ میں کمرے سے باہر آیا۔ تھوڑے سے توقّف کے بعد پھر اندر آ گیا۔ آواز بدل کر کہا اے ابو رافع! یہ آواز کیسی ہے۔ اس نے کہا' تیری ماں تجھے روئے۔ ابھی کوئی آدمی اندر آیا ہے' اس نے مجھے اپنی تلوار کا نشانہ بنایا ہے۔ عبداللہؓ بن عتیک نے بتایا' میں نے پھر اسے زور سے تلوار ماری' شدید زخمی ہو گیا مگر ہلاک نہ ہو سکا۔ پھر میں نے اس کے پیٹ پر تلوار کی دھار رکھی۔ زور سے اسے دبایا حتیٰ کہ وہ اسے چیرتی ہوئی اس کی پیٹھ تک پہنچ گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اسے قتل

کر دیا ہے۔

بعد ازاں ایک ایک دروازہ کھول کر سیڑھی تک آیا۔ نیچے اترنے لگا۔ چاندنی رات میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ زمین تک پہنچ گیا ہوں' قدم ہَوا میں رکھا' سو نیچے گر گیا۔ پنڈلی ٹوٹ گئی۔ عمامے سے باندھ کر چلنے لگا۔ دروازے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دل میں کہا' جب تک اس کے قتل کا یقین نہ ہو جائے' رات بھر باہر نہیں نکلوں گا۔ صبح جب مرغ نے اذان دی تو منادی نے دیوار پر کھڑے ہو کر اعلان کیا' اہلِ حجاز کا تاجر ابو رافع قتل ہو گیا ہے۔ یہ سن کر میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا' انہیں کہا جلدی چلو۔ اللہ تعالیٰ نے رسولُ اللہ (ﷺ) کو ایذا دینے والے ابو رافع کا خاتمہ کر دیا ہے"۔

○ ابی خلف کا واقعہ: ایک مرتبہ فخرِ دو جہاں (ﷺ) نے ابی خلف سے فرمایا تھا کہ تو میرے ہاتھ سے قتل ہو گا' یہ خوف اس کے دل میں یقین کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ لہٰذا قریش کے مکہ سے اخراج کے وقت' اُحُد کی جانب وہ آنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں مارا نہ جائے۔ ابو سفیان اسے اصرار کر کے لایا تھا۔ اس کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ اسیرانِ بدر میں شامل تھا۔ جب اس کا فدیہ قبول کیا گیا تو اس نے مکہ جانے کی اجازت پا لی تاکہ وہ فدیہ ادا کر سکے۔ اس کم بخت و مردودِ ازلی نے لوٹتے وقت حضور آقا (ﷺ) کے روبرو بکواس کی کہ اے محمد (ﷺ) میرا ایک گھوڑا ہے۔ میں اسے خوب دانہ پانی دوں گا کہ فربہ ہو جائے۔ پھر اس گھوڑے پر سوار ہو کر آپ ﷺ سے جنگ کروں گا اور آپ ﷺ کو قتل کروں گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ نہیں بلکہ اس گھوڑے پر سوار ہونے کی حالت ہی میں مَیں تجھے قتل کروں گا۔

روزِ اُحُد' حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ ابی خلف سے ہوشیار رہنا کہ

یہ ناخلف بے خبری میں پیچھے سے نہ آجائے۔ اگر کسی کو وہ نظر آئے تو مجھے بتادیں۔ اچانک جنگ کے آخر میں وہ اپنے گھوڑے پر سوار نمودار ہوا۔ جب اس کی نگاہ، حضور سرورِ کائنات (ﷺ) پر پڑی تو اس نے نالائقی کی باتیں کہنی شروع کر دیں۔ اس نے کہا اے محمد (ﷺ) آپ، میرے ہاتھ سے بچ نہ سکیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسولُ اللہ (ﷺ) ہمیں اشارۃً حکم فرمائیے۔ ہم اس پر حملہ کر دیں، اور اسے دوزخ تک پہنچائیں۔ جب یہ ملعون قریب آگیا تو آپ نے حضرت زبیرؓ بن العوامؓ (جو پاس ہی کھڑے تھے) سے نیزہ لیا (ایک روایت میں ہے کہ حارث بن الغمہ سے نیزہ لیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ نیزہ بھی اس کا ہی چھینا گیا تھا) اور اس پر پھینک دیا۔ یہ شقی کی گردن پر پڑا۔ اس وقت اس نے اپنے گھوڑے کی لگام پھیری اور اپنی قوم سے جاملا اور خود کو گھوڑے سے گرادیا۔ اور گائے بیلوں کی مانند ڈکرانے لگا۔ وہ یونہی چیختا چلاّتا رہا۔ پھر وہ ملعون، مشرکوں کے مکۃ المکرمہ پہنچنے سے قبل ہی مرّالظہران میں جو مکہ سے ایک منزل پر ہے، واصلِ جہنم ہوگیا۔

فتحِ مکّہ اور گستاخِ رسُول (ﷺ)

حضور سرکارِ ہر عالم (ﷺ) نے فتحِ مکہ کے وقت اہلِ مکہ کو امان دی تھی۔ یہ کوئی عام فتح نہیں بلکہ رب العزت کی طرف سے فتحِ مبین تھی۔ تاریخ انسانیت میں آٹھویں ہجری کا سال ہمیشہ یادگار و باوقار رہے گا۔ دشمنانِ اسلام پوری طرح بے بس و بے کس اور آپ ﷺ کے رحم و کرم پر تھے۔ اس موقع پر حضور خاتم المرسلین رحمتؐ للعالمین (ﷺ) نے ابد الاباد تک کے لئے حُسنِ سلوک کی ایک بے نظیر مثال قائم فرمادی۔ آپ ﷺ نے اللہ کے حضور میں اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور فرمایا۔ "آج تم پر کچھ ملامت نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو"۔

تاہم ایک جماعت کے لئے خاص طور پر حکم فرمایا تھا کہ وہ حِلّ و حرم میں جہاں بھی پائے جائیں، قتل کردیئے جائیں۔ اگرچہ غلافِ کعبہ میں لپٹے ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے آج کے دن، حرم بھی میرے لئے حلال ہے۔ یہ وہ جماعت تھی جو اہانت و تحقیر اور تنقیص و تعریض کی مرتکب ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ نے اہلِ ایمان کو ان گستاخوں کا خون مباح قرار دیتے ہوئے بالصراحت ارشاد فرمایا تھا:

"انہیں قتل کردو، چاہے کعبہ کے پردوں سے ہی چمٹے پاؤ"۔

سرکارِ اقدس (ﷺ) کے خلاف زبان دراز کرنے والے اس گروہ میں عکرمہ بن ابوجہل، مقیس بن صبابہ، عبداللہ بن خطل، عبداللہ بن السرح اور اس کی دو لونڈیاں شامل ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق یہ کل سترہ افراد تھے۔ اور اس موقع پر تعمیلِ ارشاد میں چار مرد قتل کئے گئے۔ سات نے پناہ مانگ لی اور چار عورتیں ماردی گئیں اور دو کو پناہ دے دی گئی۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جن کی یاوہ گوئیوں اور ہرزہ سرائیوں کا رخ نبیؐ آخر الزماں (ﷺ) کی طرف رہا تھا۔

ابنِ خطل

فتحِ مکہ سے پہلے مدینہ آکر مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے وصولیٔ زکوٰۃ کے لئے اسے بعض قبائل کی طرف بھیجا۔ اس کے ساتھ ایک انصاری تھا، اور اس کے ساتھ ایک خزانچی مسلمان۔ وہ ایک منزل پر اترا اور خزاعی مسلمان سے کہا کہ ایک بکری ذبح کرکے اس کے لئے کھانا تیار کرے اور وہ خود سو گیا۔ اس خزاعی سے کوتاہی سرزد ہوئی۔ وہ بھی سو گیا اور کھانا تیار نہ کرسکا۔ ابنِ خطل نے جب دیکھا کہ کھانا تیار نہیں ہوا تو غصے میں آکر خزاعی کو قتل کردیا اور صدقہ کے جانور لے کر اہلِ مکہ (کفّار) سے جاملا، اور ان سے کہا کہ تمارے دین کو میں نے محمد (ﷺ) کے دین سے بہتر پایا۔ اور وہ اپنی باندیوں سے آقائے مدنی

(ﷺ) کی ہجو سنا کرتا۔ جب مکہ فتح ہوا تو اس نے خانۂ کعبہ میں پناہ لی اور غلافِ کعبہ سے لپٹ گیا۔ جس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام طواف فرما رہے تھے تو کسی صحابی نے اسے دیکھ لیا اور عرض کیا، یا رسولَ اللہ (ﷺ) یہ ابنِ خطل ہے اور غلافِ کعبہ سے لپٹا ہوا ہے۔ فرمایا۔ جہاں ہو، قتل کر دو۔ لہٰذا اسے ہلاک کر دیا گیا۔ سعید بن حارث نے بروایت ابو عثمان مہدی ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے کہ اسے ابو برزہ نے قتل کیا تھا۔

چنانچہ حدیثِ پاک میں مذکور و مسطور ہے: ”عبداللہ بن خطل، کعبہ شریف کے پردوں سے چمٹا ہوا پایا گیا، اسے قتل کرنے کے لئے حضرت سعیدؓ بن حارث اور حضرت عمّارؓ بن یاسر دوڑے، لیکن حضرت سعید حضرت یاسرؓ سے زیادہ نوجوان تھے۔ آپ نے آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیا۔ اس سلسلے میں حضور نبیٔ کریم (ﷺ) کے تشریعی اختیارات اور ارشادات سے واضح طور پر ظاہر ہے کہ گستاخِ رسول (ﷺ) کے لئے کعبہ میں بھی امان نہیں ہے۔ جو آپ ﷺ کا باغی و سرکش ہوا، وہ ہر جگہ، ہر وقت اور ہر جگہ میں واجب القتل ہے۔

اس واقعہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ نہ صرف آپ ﷺ نے اس پورے گروہ کو قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا تھا بلکہ آپ ﷺ نے فتحِ مکہ سے قبل اور فتح کے وقت اپنے صحابہؓ سے ان کے قتل کا عہد بھی لیا تھا۔

○ حویرث بن نقید (بنو عبد قُصَی): یہ بھی قبلِ ہجرت، مکہ میں حضور (ﷺ) کو بہت ایذائیں دیتا تھا۔ اس کو حضرت علیؓ نے فتح کے دن مکہ قتل کیا۔ یہ ایک غلیظ و شقی شاعر تھا، اور دربارِ رسالت (ﷺ) کی ہجو بیان کرتا۔ فتحِ مکہ کے روز جب اس نے اپنا مباح الدّم ہونا سنا تو گھر میں بیٹھ گیا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ حویرث کو جب معلوم ہوا کہ حضرت علی المرتضیٰؓ اس کی تلاش میں ہیں تو وہ اپنے گھر سے نکل کر

کسی دوسرے گھر میں چھپنا چاہتا تھا کہ ایک کوچے میں حضرت علیؓ کو دکھائی دیا۔ چنانچہ انہوں نے دیکھتے ہی اس کم بخت کی گردن اڑا دی۔

○ حارث بن طلا طلا: یہ فتحِ مکہ کے دن سیّدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کی تلوار سے کیفرِ کردار کو پہنچا۔ کیونکہ یہ بدنہاد ہر طرح سے حضور آقا و مولا (ﷺ) کو ایذا دینے میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھتا تھا۔

○ مقیس بن صبابہ: روایت ہے کہ مقیس بن صبابہ کو لوگوں (صحابۂ کرامؓ) نے بازار میں پایا تو اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

○ قریبہ اور ارنب: ابنِ خطل کی یہ دو گانے والی باندیاں تھیں، جو سرکارِ مدینہ (ﷺ) کی ہجو گایا کرتی اور دل سے بھی آپ ﷺ کی پکّی دشمن تھیں۔ تیسری قرتنا تھی جو موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلی اور پھر سیّدِ عالم (ﷺ) کی امان حاصل کر کے مسلمان ہو گئی۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں باندیاں اپنے اس جرم کی بناء پر قتل کر دی گئیں۔

اُمِّ سعد بھی اسی قماش کی تھی، جو کہ قتل کی سزا سے دوچار ہوئی۔ سارہ بنی المطلب کی ایک باندی بھی اس قبیح فعل کی پاداش میں ماری گئی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ قتل ہونے والی عمْرو بن ہشام کی باندی تھی۔ اسی عورت کے ہاتھ حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کے نام خط لکھ کر بھیجا تھا۔ اولاً یہ مسلمان تھی، پھر مرتد ہو کر مکہ میں آ گئی اور فتحِ مکہ کے دن حضرت علیؓ کی تلوار کے وار سے ہلاک ہوئی۔

○ متفرقات: ابن قانعؒ نے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضور سرورِ کونین (ﷺ) کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسولَ اللہ (ﷺ) میں نے اپنے باپ کو آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کے کلمات کہتے ہوئے سنا تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اس

کی یہ بات حضور پاک (ﷺ) کو ناگوار نہ گزری۔

○ حدیثِ پاک میں ہے کہ ایک شخص ہادیٔ عالم (ﷺ) کے لیئے نازیبا و ناروا الفاظ کہتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "کون ہے میرے اس دشمن کو ٹھکانے لگائے گا؟"۔ تب حضرت خالدؓ بن ولید نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے جا کر اس مردود و گستاخ کو واصل فی النار کیا۔

○ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے حضور (ﷺ) کو گالی دی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کون اس سے نپٹے گا؟ حضرت زبیرؓ نے عرض کیا۔ "میں"۔ پھر انہوں نے اس کو ٹھکانے لگا دیا۔

○ یہ بھی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضورِ مکرّم ہادیٔ اعظم (ﷺ) پر جھوٹ باندھا تو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا کہ اس شخص کو قتل کر ڈالیں۔

متفرقات روایات

○ کعب ابنِ زُہیر نے حالتِ کفر میں حضور پاک (ﷺ) کی ہجو کی تو آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرما دیا تھا۔ تاہم پھر وہ نادِم و تائب ہو کر بارگاہِ نُبوّت میں حاضر ہوا اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" پیش کیا۔ جس پر معاف فرما دیا گیا۔

○ عکرمہؓ بن ابی جہل کے قبولِ اسلام کا ذکر متفرق انداز میں آیا ہے۔ عموماً بیان ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر اس نے راہِ فرار اختیار کر لیا تھا۔ جب یہ ایک کشتی میں سوار ہوا تو وہ طوفان میں پھنس گئی۔ کشتی والوں نے کہا، اب خدائے وحدہٗ لا شریک کو پکارو، اس منجدھار میں وہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ بتوں پر سے عکرمہ کا اعتماد پہلے ہی متزلزم ہو چکا تھا۔ اور اس کے اندر کی روشنی مالکِ حقیقی کی معرفت کا راستہ دکھا

رہی تھی۔ عکرمہ نے کہا، اللہ کی قسم! اگر دریا میں مجھے اس کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا تو خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی میرا محافظ یا نگہبان نہیں ہے۔ اے میرے پروردگار! میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اِس بلا سے نجات ملتے ہی تیرے محبوب (ﷺ) کی خدمتِ ناز میں حاضر ہو کر بیعت کر لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ﷺ ضرور میرے ساتھ رحمت و شفقت اور لطف و کرم کا سلوک فرمائیں گے۔ لہٰذا وہ بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور قبول اسلام کر کے سرکارِ اقدس (ﷺ) کے دامنِ کرم میں آ گئے۔

○ عبداللہ بن ابی السرح نے پہلے اسلام قبول کیا اور پھر شیطان کے بہلاوے اور پھسلاوے میں آ کر واپس تاریکیوں میں لوٹ گیا تھا۔ عرصۂ ایمان میں کاتبِ وحی بھی رہا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے ارتداد کو قبول کیا بلکہ سرکارِ رحمت و رافت (ﷺ) کی شانِ نبوت میں زبان بھی دراز کرتا۔ فتح مکہ کے روز اس کا خون بھی مباح قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ اہلِ ایمان کو قرآن سے بدظن کرنے اور قبولِ اسلام کی فضا کو مکدّر کرنے کے لیئے کہتا کہ وحیِ الٰہی کی کتابت کے وقت میں جیسے چاہتا ویسے ہی تصُّرف کیا کرتا تھا۔ چنانچہ تائب ہو کر بارگاہِ مصطفوی (ﷺ) میں حاضر ہوا تو متعدد بار بیعت کے ارادہ سے آگے بڑھا لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے کئی بار کوشش کی مگر اس کے ساتھ مسلسل اِعراض برتا گیا۔ حدیثِ مبارکہ میں اس واقعہ کی تفصیل بالفاظِ ذیل مندرج ہے: "عبداللہ بن سرح، حضرت عثمانؓ بن عفّان کے پاس چُھپ گیا۔ جب حضور ﷺ نے لوگوں کو بیعت کے لیئے یاد کیا تو حضرت عثمانؓ نے اسے بارگاہِ رسالت میں پیش کر دیا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ (ﷺ)! اس کی بیعت قبول فرمائیے۔ آپ نے اپنا رُخِ انور اوپر اٹھایا، تین دفعہ عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ہر دفعہ بیعت سے انکار کیا۔ آخر تین دفعہ کے بعد اسے بیعت کیا۔ بعد ازاں

آپ صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہوئے۔ ارشاد فرمایا۔ "تم میں سے کوئی ایسا معاملہ فہم نہ تھا جو اس کی طرف اٹھ کھڑا ہوتا۔ جب میں نے بیعت سے ہاتھ روک لیا تھا تو اسے قتل کر دیتا"۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا۔ "یا رسولؐ اللہ! آپ نے ہمیں آنکھ سے اشارہ کیوں نہ فرمایا"۔ آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا۔ "نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ ظاہر میں چُپ رہے اور آنکھ سے اس کے خلاف اشارہ کرے"۔

○ **بشر منافق کا انجام:** خلیفۂ اسلام سیّدنا حضرت عمر فاروقؓ نے تو اس نام نہاد مسلمان کی گردن بھی اپنی تلوار سے اڑا دی تھی جو ایک یہودی کے ساتھ اپنے قصہ پر آقائے مدنی (ﷺ) کے فیصلے پر مطمئن و رضامند نہیں ہوا تھا۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کا یہ عمل گستاخِ رسول (ﷺ) کے مباح الدّم ہونے پر مدلول ہے۔ بناء بریں اس کی تائید میں آیاتِ قرآنی کا نزول اور سرکارِ اقدس و افضل (ﷺ) کا اس سے ناخوش ہونا بھی ثابت ہے۔ حالانکہ اگر سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو بظاہر منافق کی کوئی گستاخی سامنے نہیں آتی۔ مطلب یہ کہ دربارِ رسالت مآب (ﷺ) میں خاموش بے ادبی و بے حیائی کا ایک انداز بھی واجب القتل ٹھہرا دینے کے لئے کافی ہے۔ آپ نے اس معاملے میں حضورِ پاک (ﷺ) سے اجازت نہیں لی، اور نہ ہی توبہ و معافی کا کوئی موقع دیا تھا۔ بلکہ صورتِ حال سے آگاہ ہوتے ہی اسے فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

عہدِ رسالت مآب (ﷺ) میں وقوع پذیر اس نظیر کا پس منظر یوں قلمبند ہوا ہے: "بے شک یہ آیات کریمہ (سورۃ النساء: ۶۰-۶۳) اس وقت نازل ہوئیں جب دو آدمی اپنا جھگڑا لے کر حضورِ اکرم (ﷺ) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور نبی پاک (ﷺ) نے ان کے درمیان فیصلہ فرمایا تو جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا، اس نے کہا ہمیں اپنا یہ جھگڑا لے کر حضرت عمرؓ کے پاس جانا چاہئے۔ پس

وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس چلے گئے۔ جس نے حضرت عمرؓ کے پاس جانے کا مطالبہ کیا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کو قتل کر دیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔

سورۃ النساء کی اسی آیہ کے تحت حاشیۂ صدر الافاضل میں درج ہے کہ بشر نامی ایک منافق کا کسی یہودی سے جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا، چلو سیّدِ ہر عالم (ﷺ) سے معاملہ طے کرا لیں۔ منافق نے خیال کیا کہ حضورِ پاک (ﷺ) تو بے رو رعایت حق فیصلہ دے دیں گے اور اس کا مطلب حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے اس نے باوجود مدعیٔ ایمان ہونے کے کہا کہ کعب بن اشرف یہودی کو پنچ بناؤ۔ یہودی جانتا تھا کہ کعب رشوت خور ہے۔ اس لئے اس نے باوجود ہم مذہب ہونے کے اس کو پنچ تسلیم نہ کیا۔ ناچار منافق کو فیصلہ کے لئے امام الحرمین (ﷺ) کے حضور آنا پڑا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو فیصلہ دیا، وہ یہودی کے موافق ہوا۔ یہاں سے فیصلہ سننے کے بعد منافق پھر یہودی کے درپے ہوا اور اسے مجبور کر کے حضرت عمرؓ کے پاس لایا۔ یہودی نے آپ سے عرض کیا کہ میرا اور اس کا معاملہ سیّد السّادات فخرِ کائنات (ﷺ) طے فرما چکے ہیں، لیکن یہ حضور (ﷺ) کے فیصلہ سے راضی نہیں اور آپ سے فیصلہ چاہتا ہے۔ فرمایا، ہاں میں ابھی آ کر اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔ یہ فرما کر مکان میں تشریف لے گئے اور تلوار لا کر اس کا سر اڑا دیا۔ اور فرمایا جو رسولؐ اللہ (ﷺ) کے فیصلہ سے راضی نہ ہو، میرے پاس اس کا یہی فیصلہ ہے۔

بعض بیان کرتے ہیں کہ محسنِ انسانیت (ﷺ) سے فیصلہ سننے کے بعد منافق اس مقدمے کو لے کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس بھی لے گیا تھا اور وہاں سے یہودی کے حق ہی میں فیصلہ صادر ہوا۔ تاہم سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ ساری

صورتحال سے آگاہ نہ تھے۔ روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد منافق سے تصدیق کے لئے پوچھا، کیا واقعی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فیصلہ فرما چکے ہیں؟ اس نے کہا، ہاں ایسا ہو چکا ہے۔ چنانچہ راوی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے دونوں سے فرمایا۔ "تم میرے واپس آنے تک یہیں ٹھہرے رہو۔ یہاں تک کہ میں تمہاری طرف نکل آؤں"۔ حضرت عمرؓ گھر تشریف لے گئے، تلوار اٹھائی، چادر اوڑھی اور باہر نکلے۔ اس منافق کی گردن مار دی۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ازاں بعد فرمایا: میں اسی طرح فیصلہ کرتا ہوں، اس شخص کے بارے میں، جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے فیصلے سے راضی نہ ہو"۔

معروف ہے کہ یہ خبر چہار سُو پھیل گئی۔ حضور نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمتِ عالیہ بھی اس کی اطلاع پہنچی، کہا گیا کہ حضرت عمرؓ نے ایک کلمہ گو کو ناحق ہلاک کر دیا ہے۔ اس موقع پر شہنشاہِ ہر عالم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: "میں گمان نہیں کرتا کہ عمرؓ کسی مومن کے قتل کی جرأت (اقدام) کرے"۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "کیا نہیں دیکھا آپ نے ان کی طرف جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے۔ اس (کتاب) کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لئے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس کی بات نہ مانیں"۔ (النساء: ۶۰)

ان آیات و احکامات کی شانِ نزول کے متعلق علماءِ تفسیر و حدیث نے یہودی و منافق کا یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ یہاں طاغوت سے مراد وہ فیصل ہے جو احکامِ الٰہی کے خلاف مقدمات نپٹاتا ہو۔ یعنی شیطان کا نمائندہ۔ یہ کعب بن اشرف کی طرف اشارہ ہے۔

الغرض جب اس کے ورثا حضورؐ ختمی مرتبت (ﷺ) کی خدمتِ

اقدس میں مطالبۂ قصاص لے کر آئے تو یہ آیات نازل ہوئیں: "پس کیسی ہو گی پہنچے گی۔ انہیں بڑی آفت، اس کی وجہ سے جو آگے بھیجے ان کے ہاتھوں نے۔ پھر وہ آئیں گے آپ ﷺ کے پاس، قسم کھائیں گے اللہ کی کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا اور اتفاق کرنے کا۔ یہی وہ ہیں کہ جانتا ہے اللہ، وہ جو دلوں میں ہے ان کے۔ پس منہ پھیر لو ان سے اور نصیحت کرو انہیں، اور کہو ان سے ان کے دل میں پہنچنے والی (مؤثر) بات"۔ (النساء: ۶۲، ۶۳)

مفسرین کے نزدیک فاعرض عنھم کے الفاظ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ ان کے قصاص کے مطالبہ کو مسترد فرما دیں۔ اس لئے کہ وہ شخص فی الواقع قتل کا مستحق تھا۔ قاضی ثناء اللہ (پانی پتی) ان آیات (۶۰ تا ۶۳) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ "آپ ﷺ ان کے عذر اور مطالبہ قصاص کو ہرگز قبول نہ فرمادیں، کیونکہ وہ شخص مباح الدّم تھا"۔ (جو کہ قابلِ قصاص نہیں ہے)

مختصر یہ کہ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے اس درست اقدام کی تائید و توثیق میں جبریلِ امین بارگاہِ نبوی (ﷺ) میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "بے شک حضرت عمرؓ نے حق و باطل کے مابین امتیاز (فرق) کر دیا ہے"۔ نیز اس تاریخی موقع پر نبیٔ آخر الزماں (ﷺ) نے مسرت کا اظہار فرمایا اور حضرت عمرؓ کو وہ بے مثال لقب عطا فرمایا جو ہمیشہ کے لئے آپ کے نام کا حصہ اور پہچان ہو گیا۔ پس نبیٔ پاک (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: "اے عمر! آج سے تم فاروق (حق و باطل میں فرق ظاہر کرنے والے) ہو گئے۔

بیہقی کی روایت کے مطابق حکم بن ابی العاص ایک دفعہ حضور نبیٔ کریم (ﷺ) کی مجلس میں بیٹھا تھا، اور جب آپ ﷺ کلام فرماتے تو یہ اپنا منہ بنا کر، نتھنے پھلا کر اور منہ کو پھڑکا کر منافقوں سے آنکھ کا اشارہ کرتا، جس کا مطلب

حضور اکرم (ﷺ) کے کلام کا مذاق اڑاتا یا اس کی تکذیب کرتا تھا۔ حضورِ پُرنور شافع یوم النشور (ﷺ) نے اس کی یہ حرکت دیکھ کر فرمایا کہ تو ایسا ہی ہو جا۔ آپ ﷺ کی بددعا کا اثر یہ ہوا کہ وہ مرتے دم تک ایسا ہی رہا کہ منہ پھڑکایا کرتا تھا۔

یہ دینِ اسلام کی حقیقی تعبیر اور واقعی چہرہ ہے۔ مگر ان دلائل کے باوجود معترضین و مخالفین غیرت مند مسلمانانِ عالم کو اکثر و بیشتر یہ پٹی پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر وہ واقعتہ "اسلامی جہاد" کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے قرآن اور احادیث اور سیرت کو دیکھ کر معلوم کریں کہ اس طرح کی صورتِ حال جب دورِ اول میں پیش آئی تو خود رسول (ﷺ) اور آپ ﷺ کے اصحاب نے اس معاملہ میں کس قسم کا ردِّعمل پیش کیا۔ بالآخر ان کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے: "جب ہم اس اعتبار سے دورِ اول کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی گستاخی کرنے والے غیر مسلموں کے خلاف کبھی بھی اس طرح کی کارروائی نہیں کی گئی جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے کی یا کر رہے ہیں ---- اس کے بجائے جو کچھ کیا گیا' وہ صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے حق میں دعائیں کی گئیں۔ اور دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی تردید کی گئی۔ اس سے آگے ان کا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دیا گیا۔

حالانکہ "شتمِ رسولؐ کا مسئلہ" قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ کی روشنی میں اس سے قطعاً" مختلف صورتحال رکھتا ہے۔ بابِ اول (اللہ کی سنت) میں اس کی فرضیت و ناگزیریت قرآن مجید کی رو سے ثابت کر دی گئی ہے' جب کہ زیرِ نگاہ باب میں احادیثِ مبارکہ کے حوالے اور عملِ رسول (ﷺ) کے اجالے سے اس کی واقعیت و اہمیت مسلم ہے۔ یہ نظائر کتبِ احادیث و سیَر میں امرِ واقعی کے طور پر موجود

و محفوظ ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایسے لوگوں کے لیئے صرف دعائیں کی گئی ہوں یا پھر دلائل و براہین کی زبان ہی میں ان سے بات کی گئی ہو۔ حرفِ دعا ان کے لیئے کاری ہے جو دعوتِ حق کے ادراک و شعور سے فی الواقع عاری ہوں۔ استدلال کا جمال و کمال فقط ان لوگوں کے کام آتا ہے جن کا نام متلاشیانِ حق کی فہرس میں لکھا جا چکا ہو۔ دعا اور دلیل کے ہتھیار تو تلاشِ صداقت کے مسافروں کے لیئے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو خرمنِ اسلام کو جلانا اور چراغِ مصطفوی ﷺ کو بجھانا چاہتے ہوں۔ وہ لوگ جو دشمنی میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ وہ لوگ جن کے کان سچائی کی آواز سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ لوگ جن کی آنکھیں حقانیت کے نقوش کو دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ وہ لوگ جن کے دماغ سمجھ کر بھی کچھ نہیں سمجھنا چاہتے۔ وہ لوگ جن کے دل' حسنِ فطرت کو دیکھ کر مچلنا ہی نہیں جانتے۔ وہ لوگ جو کتمانِ حق کی حدود سے بھی بہت دور جا چکے ہیں۔ وہ لوگ جن کا دستورِ زندگی ہی حق دشمنی اور باطل پروری بن چکا ہو۔ وہ لوگ جن کے جسم اور جان کے امراض ناقابلِ علاج ٹھہر چکے ہیں اور وہ لوگ جن کے بارے میں خداوندِ قدوس کا یہ حکم صادق آتا ہو کہ ان کے دلوں' کانوں اور آنکھوں پر مُہر لگا دی گئی ہے۔ ان کو سمجھانا یا نہ سمجھانا برابر ہے۔ ان لوگوں کے سلسلے میں قوتِ دعا اور قوتِ دلیل کیسے اور کیونکر مؤثر ہو سکتی ہے؟ اور وہ لوگ جن کا موذی و متعدی مرض ہر لحاظ سے معاشرے میں حفظانِ صحت کے تقاضوں کا قاتل ہو' کیا ایسے اشخاص کا قلع قمع حکمت و مصلحت کے خلاف ہے؟ اسلام دشمنی میں متوارث امراض اس پر مستزاد ہیں۔ انسانی بدن کے کسی حصے میں جب ناسُور پڑ جائے اور کوئی طبیبِ حاذق اسے ناقابلِ اصلاح قرار دے دے تو پھر اس کا ایک ہی علاج باقی رہ جاتا ہے کہ متأثرہ عضو کو کاٹ کر رکھ دیں۔ کسی خبیث الفطرت اور کمینہ خصلت شخص کا جو محسنِ انسانیت (ﷺ) کو سَبّ و شتم کا نشانہ بنا کر سلطنتِ اسلام میں انتشار و

بدامنی پھیلائے، فرزندانِ اسلام کا دل دکھائے اور مزید یہ کہ بنی نوعِ انساں کو ہلاکت و بربادی کے راستہ پر لگائے، اس کا موت کے سوا اور کیا علاج ہو سکتا ہے؟

قاضی عیاضؒ منافقین کے حوالے سے پیش آنے والے بعض واقعات و احکامات کی تطبیق میں لکھتے ہیں: "نیز یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ وہ لوگ ابھی نئے نئے (بظاہر) مسلمان ہوئے تھے (لوگوں پر) واضح نہیں تھا کہ ان میں کتنے لوگ کفر کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہو چکے ہیں اور کتنے ہنوز ملوّث ہیں۔ پھر یہ بھی کہ سارے عرب میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور بظاہر وہ (منافق / شاتم) حضورِ اکرم (ﷺ) کے صحابی اور دینِ اسلام کے اعوان و انصار سمجھے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر حضورِ پاک (ﷺ) ان کے نفاق اور ان باتوں کی وجہ سے جو کبھی کبھار ان سے ظاہر ہوتیں یا اس علم کی بناء پر جو حضورِ اقدس (ﷺ) کو ان کے دلی خیالات پر واقفیت حاصل ہونے سے ہوتا تھا، انہیں قتل کر دیتے تو لازماً" اسلام سے نفرت کرنے والوں کو موقع مل جاتا، اور ان کے منہ میں جو آتا کہتے۔ اس سے جاہل لوگ شک میں پڑ جاتے۔ دشمن جھوٹی باتیں بناتا اور بہت سے لوگ اسلام قبول کرنے اور آپ ﷺ کی صحبت اختیار کرنے سے گھبراتے۔ بدگمانی کرنے والا، بدگمانی کرتا اور ظالم دشمن یہ خیال کرتا کہ شاید آپ ﷺ نے انہیں کسی عداوت کی بناء پر یا بدلہ لینے کے لئے قتل کرایا ہے۔ میں نے جو باتیں کی ہیں (اپنی طرف سے نہیں بلکہ) حضرت امام مالکؒ بن انس کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب ہیں"۔

غرضیکہ اس باب سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

○ یہ کہ احادیثِ مبارکہ سے گستاخانِ نبی (ﷺ) کے لئے سزائے موت کا نافذ کیا جانا ثابت ہے۔ اور فی الواقع بہت سی نظائر موجود ہیں۔

○ یہ کہ رسولِ پاک (ﷺ) کو ایذا پہنچانے والوں کو خود آپ ﷺ کے حکمِ خاص سے ٹھکانے لگایا جاتا رہا۔

○ یہ کہ گستاخان و شاتمان کو جن اصحابؓ نے کیفرِ کردار تک پہنچایا، آپ ﷺ نے ان کی تحسین فرمائی اور اظہارِ مسرّت کیا۔

○ یہ کہ بنو قُرَیظہ کے چھ سات سو کے قریب جنگجو افراد کا قتل کیا جانا، اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کا حکم قائم کرنے کے لئے باطل کی سازشوں، فتنہ پروریوں اور فتنہ انگیزیوں کو بزورِ طاقت بھی مٹایا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور اس سے غفلت پورے ملّی وجود کو ہلاکت سے دوچار کر سکتی ہے۔

○ یہ کہ عملِ رسول ﷺ کی رو سے یہ نظائر اسلام کی مبادیات و اساسات کا لازمی حصہ قرار پاتے ہیں۔

○ یہ کہ ایسے واقعات میں فقط بدعہدی کی وجہ سے سزائے قتل قائم نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ ان افراد کو مجرد گستاخیٔ رسالت کی پاداش میں فنا کے گھاٹ اتارا گیا۔ وگرنہ نقضِ عہد کا قانون وہاں لاگو ہوتا ہے، جہاں کوئی عہد موجود بھی ہو۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ غزوۂ بدر سے واپسی پر گردن مار دیئے جانے والے متذکرہ قیدیوں سے انفرادی طور پر کوئی عہد نہیں بندھا ہوا تھا۔ اور اگر کوئی عہد ہی موجود نہ ہو تو پاسِ عہد کے کیا معنی؟

○ یہ کہ سُنّتِ رسول ﷺ کے ثبوت کے بعد اس سے انکار، پورے دین کا انکار ہے۔ نیز یہ کہ اس کو دل پسند معانی پہنانا، کھینچ تان کر اپنی فکرِ خام کے قریب لانا یا مقراضِ باطل سے پیوست کر کے کوئی حسبِ ضرورت خاکہ بنانا دراصل شرک فی النّبوت ہے اور اس جرم کی سزا بجائے خود موت ہے۔

عہدِ صحابہؓ کی مثالیں

ناموسِ رسالت ﷺ کا موضوع آبگینے سے نازک اور اساسی ہے۔

دراصل یہ مسئلہ ایمان کا معیار ہے۔ عہدِ صحابۂ کرامؓ میں بھی ارتکابِ توہینِ رسول ﷺ پر موت کی سزا مقرر تھی۔ منافقین کے ارتکابِ گستاخی کے موقع پر صحابۂ کرامؓ کا حضورِ پُرنور شفیع یوم النشور احمدِ مجتبیٰ، حضرت محمدِ مصطفیٰ (ﷺ) سے ان کے قتل کی اجازت طلب کرنا اس بات کی ایک دلیل ہے کہ صحابۂ کرامؓ جانتے تھے کہ شاتمِ رسول (ﷺ) کی سزا قتل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ رسالت مآب (ﷺ) نے اپنے صحابہ کو گستاخانِ شان رسالت (ابو رافع یہودی اور کعب بن اشرف وغیرہم) کی گردن مارنے کا حکم دیا تھا، اور اس بناء پر وہ علم رکھتے تھے کہ آقا و مولا (ﷺ) کی شانِ زیبا میں زبان درازی کرنے والا لازمی طور پر ہلاکت کا مستحق ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ صحابۂ کرام جانتے تھے کہ رسولُ اللہ (ﷺ) نے بعض مواقع پر خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر قبولیت اسلام کے ساتھ معافی مانگنے والے کی جاں بخشی اپنے ذاتی حق و اختیار سے فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کو یہ اختیار و حق حاصل تھا کہ کسی کو معاف فرمادیں جیسا کہ بعض احکامِ شرع کے متعلق سند سے ثابت ہے مثلاً ایک صحابی حضرت براءؓ بن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت ابوہریرہؓ کو بکری کے ایک بچے کی قربانی کرنے کا حکم دیا اور اجازت مرحمت فرمائی۔ نیز ارشاد فرمایا:

ولن تجزی عن احد بعدک تمہارے علاوہ (یہ قربانی) کسی دوسرے پر ہرگز جائز نہیں ہے۔ بناء بریں بعض کا مذہب یہ بھی ہے کہ حلال و حرام اور عذر خواہی کے

قبول و عدمِ قبول کے امورِ شرعیہ، حضور (ﷺ) کے سپرد فرمادیئے گئے تھے۔ للذا یہ اختیار آپ ﷺ کو تو حاصل ہے کہ کسی مصلحت یا حکمت کے تحت ان منافقین پر حد جاری فرمائیں یا نہ فرمائیں مگر حضورِ اقدس (ﷺ) کے علاوہ اسے کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا۔ آپ ایک آدمی پر کسی بات سے ناراض ہوئے تو اس نے زیادتی کی۔ میں نے کہا اے خلیفۃ الرسول! مجھے اجازت ہو تو اس کا سر قلم کر دوں۔ انہوں نے کہا: میری بات نے اس کے غضب و غصہ کو ختم کر دیا ہے۔ پھر آپ اٹھے، اندر گئے اور بعد ازاں مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا تو کہا۔ ”آپ نے ابھی کیا کہا تھا؟“۔ میں نے عرض کی کہ مجھے اجازت دیں تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں۔ فرمایا، اگر میں آپ کو حکم یا اجازت دے دوں تو ایسا کر گزرو گے؟ میں نے عرض کی کہ ہاں۔ آپ نے کہا۔ ”نہیں! قسم بخدا، رسول اللہ (ﷺ) کے بعد یہ کسی کے لئے جائز نہیں“۔

بعض علماء جن میں ابوداؤد، اسماعیل، اسحاق القاضی، ابوبکر، عبدالعزیز اور قاضی ابو یعلیٰ وغیرہ بھی شامل ہیں، نے اِس سے شاتمِ رسول (ﷺ) کے قتل کے جواز کی سند پکڑی ہے۔ استدلال یہ ہے کہ ابوہریرہ نے جب دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو گالی دی گئی ہے تو آپ کو غصہ آیا۔ انہوں نے آپ سے اس آدمی کے قتل کی اجازت طلب کی۔ اگر سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ انہیں حکم یا اجازت دے دیتے تو وہ ضرور اسے مار دیتے لیکن صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا کہ رسولُ اللہ (ﷺ) کے بعد یہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل نکات خاصے غور طلب ہیں:

○ یہ کہ اگر کوئی نبیٔ کریم (ﷺ) کی بارگاہِ اقدس میں زبان درازی کا مرتکب ہو تو وہ واجب القتل ہے۔ نیز یہ کہ شاتمِ رسول (ﷺ) کی گردن مار دیا جانا

دراصل اطاعتِ رسول (ﷺ) ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے بعض مواقع پر تعمیل ارشادِ خداوندی میں ایسا ہی کیا تھا۔

○ یہ کہ محبوبِ خدا (ﷺ) کے علاوہ کسی اور شخصیت کے بارے میں بدزبانی کی جسارت کرنے والے کو قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے کہ یہ سزا توہینِ رسول (ﷺ) کے جرم میں مختص ہے۔

○ یہ کہ جس کسی نے بھی آپ (ﷺ) کی شان میں گستاخی کی، اس کا قتل جائز اور لازم ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس حدیث کے عموم سے مسلمان اور کافر دونوں کے لئے قتل کی سزا کے نافذ العمل ہونے کا استدلال کیا جائے گا۔

○ یہ کہ رسولِ پاک (ﷺ) کی شانِ بابرکات میں گستاخی کے مرتکبین کے لئے سزائے قتل کا معاملہ تو حق الیقین کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ لیکن بعض صحابہ آپ (ﷺ) کے خلیفہ کے متعلق یاوہ گوئی پر بھی گردن ماردینے کا جذبہ رکھتے تھے۔

○ یہ کہ آقاو مولا (ﷺ) کو از روئے حکمِ الٰہیہ اپنے شاتمان کو کیفرِ کردار تک پہنچادینے کا اختیار حاصل تھا مگر آپ کے بعد کسی دوسرے شخص کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی دشمن و گستاخ پر یہ حد لاگو کرسکے۔

امام ابنِ تیمیہ نے "الصّارم المسلول علیٰ شاتمِ الرسول (ﷺ)" میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک عورت حضور نبیٔ کریم (ﷺ) کو گالی دیا کرتی تھی۔ ایک آدمی نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ یہاں تک کہ وہ مرگئی لیکن آقائے نامدار حبیبِ کردگار (ﷺ) نے ان کا خون رائیگاں فرمایا تو اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شاتمانِ نبی کے لئے اللہ و رسول ﷺ کا یہی فیصلہ ہے۔ نہیں تو قاتل سے باز پرس کی جاتی اور قصاص یا دیت کا اجراء ہوتا۔ لہٰذا یہ حدیث شاتمِ رسول (ﷺ) کے قتل کے جواز پر نص ہے۔

اس واقعاتی حدیث سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

○ یہ کہ عہدِ رسالت مآب (ﷺ) میں آپ ﷺ کے دشمن و گستاخ کو واصل فی النّار کیا گیا تو مولائے کائنات (ﷺ) نے گویا کہ اس کی تائید فرمادی۔

○ یہ کہ صحابۂ کرام کا رویّہ گستاخانِ رسول (ﷺ) کو قتل کردینے کا تھا اور موقع ملتے ہی وہ اس پر عمل بھی کر گزرے۔

○ یہ کہ گستاخِ رسول (ﷺ) کو عدالت کے کٹہرے تک لے جانا یا اس سلسلے میں قانون کے تقاضے پورے کرتے رہنا لازم نہیں ہے۔ اگر گستاخی کا ٹھوس ثبوت میسر آجائے تو کوئی بھی مسلمان اس کو ہلاک کرسکتا ہے۔

○ یہ کہ اگر حکومت و ریاست اسلامی نوعیت کی ہو اور یقین کیا جائے کہ حاکم و عدالت گستاخِ رسول (ﷺ) کو قرارِ واقعی سزا دیں گے تو پھر مجرم کو ازخود انجام تک پہنچانے کی بجائے قانون و انتظامیہ کے سپرد کردینا موزوں ہے۔

○ یہ کہ رسولِ خدا (ﷺ) کی اہانت و تنقیص پر چپ رہنا بے غیرتی و بے حمیتی ہے۔ دینِ فطرت کی رُو سے بے غیرت کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ اور یہ اس درجہ کی بے غیرتی ہے کہ سرکارِ اقدس (ﷺ) کی توہین برداشت ہو جانا بے ایمان ہونے کا اعلان ہے۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے زمانۂ خلافت میں اطلاع ملی کہ فلاں والی نے ایک عورت کے دانت اکھڑوا دیئے ہیں، کیونکہ اس عورت نے حضور علیہ السلام کی شان عالی میں بعض ناروا کلمات بکے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا: "اب سزا دی جا چکی ہے۔ ورنہ میں حکم دیتا کہ عورت کو قتل کردیا جائے۔ اس لئے کہ جو رسولُ اللہ (ﷺ) کی شان مبارک میں ارتکاب گستاخی کرے، اس کی سزا قتل ہے"۔

نہ صرف یہ بلکہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرطِ عقیدت میں کہا تھا:

"مجھے محبوب خدا (ﷺ) خود خدا سے بھی زیادہ محبوب ہیں"۔ وجہ یہ قرار پائی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی تو آپ کے وسیلۂ جمیلہ سے ہی حاصل ہوئی۔ ورنہ لوگ گمراہی کی وادیوں میں بھٹک رہے ہوتے اور توحید پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مر کھپ جاتے۔ حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ اس مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

معنیٔ حرفم کُنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدّیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسولُ اللہ (ﷺ) بنی عمرو بن عوف کے ہاں' ان کے درمیان صلح کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے۔ اس اثناء میں نماز کا وقت ہو گیا۔ مؤذنِ رسولؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ کیا آپ نماز پڑھائیں گے اور میں تکبیر کہوں؟ آپ نے جواب دیا' ہاں! حضرت ابوبکر صدّیقؓ نماز پڑھانے لگے۔ اتنے میں حضور (ﷺ) تشریف لے آئے اور صحابۂ کرام حالتِ نماز میں تھے۔ آپ ﷺ پر لوگوں کی نگاہ پڑی تو انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں' بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا شروع کیں تاکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سرکارِ اقدس (ﷺ) کی آمد کی خبر ہو جائے۔ ادھر سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نماز میں انہماک دیدنی ہوتا تھا۔ لہٰذا صحابۂ کرامؓ نے تصفیق (ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنا) میں زیادتی کی تو متوجہ ہوئے تو رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جگہ ہی ٹھہرے رہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور رسول اللہ (ﷺ) کے اس حکم پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی' پھر پیچھے ہٹ کر صف میں مل گئے۔ حضورِ پاک (ﷺ) آگے بڑھے' نماز پڑھائی اور

جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا۔ "اے ابوبکرؓ! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اپنی جگہ (امامت) پر ثابت قدم رہتا۔ جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ ابو قحافہ کے بیٹے کو یہ حق نہیں کہ وہ حضور (ﷺ) سے آگے ہو کر نماز پڑھائے"۔

اس سے مترشّح ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عقیدہ و نظریہ کی رو سے حضورِ اکرم شفیعِ معظم (ﷺ) کا ادب و احترام نماز میں بھی مقدّم ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے آقا و مولا (ﷺ) کے حکم کے باوجود طریقِ ادب اختیار کیا اور حضورِ پاک (ﷺ) نے بھی یہ عذر رد نہ فرمایا' بلکہ اسے شرفِ قبولیت بخشا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دوران نماز پیچھے ہٹ آنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا ادب و لحاظ' عبادت سے بھی بڑھ کر اور فوقیت کے درجہ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ بدر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کوئی بیٹے ابوجہل کی قیادت میں تھے۔ ازاں بعد انہیں قبولیتِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دن عرض کیا: "ابا جان! آپ غزوۂ بدر میں کئی مرتبہ میری زد میں آئے مگر میں اپنی تلوار کو پیچھے ہٹا لیتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ سن کر فرمایا: بیٹا! ربِّ کعبہ کی قسم! اگر تو ایک مرتبہ بھی میری تلوار کی زد میں آ جاتا تو تیری گردن اڑا دیتا۔ اس لئے کہ میرے آقا و مولا (ﷺ) کے مقابل کھڑا ہونے سے تیرا میرا کوئی رشتہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ کوفہ کو لکھا کہ کسی شخص کا نام' نبیٔ پاک (ﷺ) کے نام پہ مت رکھ۔ اس کو ابو جعفر طبری نے بیان کیا ہے اور محمد بن سعد سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بھتیجے' محمد بن زید بن خطاب سے فرمایا کہ میں اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ تمہاری وجہ سے رسول اللہ (ﷺ) کی اہانت ہو۔ واللہ! جب تک میں زندہ ہوں' تمہارا نام "محمد" نہ پکارنے دوں گا۔ اور ان کا نام

"عبداللہ" رکھ دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ اس بات کی عام ممانعت کر دیں کہ عزت و برکت کے لئے ہی سہی، کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے نام پر نام نہ رکھے۔ لیکن بعد میں اس خیال سے اس لیئے باز رہے، چونکہ رسول اللہ (ﷺ) کے وصال کے بعد آپ (ﷺ) کے نام پر نام اور کُنیت پر کنیت جائز ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر سیدِ کائنات فخرِ موجودات (ﷺ) نے تبرکاً" و "ثبتاً" اس کی اجازت (بعد از وصال) نہ فرمائی ہوتی تو فاروقِ اعظمؓ لازمی طور پر اس کا حکماً" امتناع فرمادیتے۔

"الصّارم المسلول علیٰ شاتم الرّسول ﷺ" میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس قبیلہ بنی تمیم سے ایک شخص آگیا اور الذاریات والمرسلات والنازعات کے بارے میں سوال کیا یا ان میں سے کسی ایک کے متعلق کچھ پوچھا۔ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی بصیرت نے اس کے قلبی مرض کا اندازہ کرلیا کہ یہ آدمی اپنے دل و دماغ میں رسولُ اللہ (ﷺ) سے بُغض و عناد اور عداوت و کدورت رکھتا ہے۔ اسے گستاخی و ادبی کی بیماری لاحق ہے۔ لہٰذا آپ نے اسے حکم دیا: "اپنے سر سے کپڑا ہٹا" جب اس نے کپڑا ہٹایا تو اس کے سر پر بال موجود تھے۔ آپ نے اس سے فرمایا۔ بخدا! اگر میں تیرے سر کو مونڈا ہوا پاتا تو میں تیرے سر کو قلم کر دیتا، جس میں تیری دونوں آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں"۔

درحقیقت حضرت عمر فاروقؓ کے ذہن و شعور میں اپنے آقا و مولا (ﷺ) کی بیان فرمائی ہوئی وہ علامات محفوظ تھیں۔ ان نشانیوں میں سے ایک سر کا مُنڈا ہوا ہونا بھی تھا۔

روح البیان میں علامہ اسماعیل حقیؒ درج فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو پتا چلا کہ ایک امام مسجد نماز میں ہمیشہ سورہ عبس کی قراءت کرتا ہے تو آپ نے اسے موت کا ذائقہ چکھا دیا، اس لیئے کہ وہ حضورِ اقدس (ﷺ) کے مقاماتِ جلیلہ و

درجاتِ عالیہ کی تنقیص کے ارادے سے اس کی قرائت کیا کرتا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ مقتدیوں کے دل میں سے قدر و منزلت جاتی رہے اور قدر و منزلت و رفعت و عفّت کا احساس کم ہو۔ یہی سبب ہے کہ وہ نگاہِ فاروقی میں واجب القتل ٹھہرا۔ اس واقعہ کی مناسبت سے درج ذیل امور مستنبط ہوتے ہیں:

○ یہ کہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی کوئی سورۃ یا آیہ بھی اگر، صاحب الکتاب (ﷺ) کی تنقیص کے ارادہ و نیّت سے پڑھی جائے تو ایک ایسا ناقابلِ معافی جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے کہ اس پر لازماً" حد جاری ہو گی۔ نیز آپ ﷺ کے حضور اشارہ و کنایہ سے گستاخی بھی گردن زدنی ٹھہرادیتی ہے۔

○ یہ کہ شاتمِ رسول (ﷺ) سے نہ تو توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، نہ کوئی توجیہ قابلِ قبول ہو گی، اور نہ ہی الفاظ کے پیچوں میں الجھا جائے گا، بلکہ سادہ طریق سے حکمِ قرآنی و عملِ نبوی ﷺ کے فلسفہ و روح پہ نظر رکھ کر فیصلہ صادر ہو گا۔

حضرت عثمان ذُوالنّورینؓ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے جس ہاتھ سے سرورِ کائنات (ﷺ) سے بیعت کی تھی، ہمیشہ اس کی تقدیس محفوظ رکھی اور مبارک جانا، اور یہ کہ اپنے آقا و مولا (ﷺ) کے بغیر طوافِ کعبہ بھی انہیں گوارا نہیں ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ کفارِ مکہ نے انہیں بخوشی اجازت دے دی تھی۔ بات دراصل یوں ہے کہ سیدنا حضرت عثمان غنیؓ نے کعبہ کو بھی حضورِ پُرنور (ﷺ) کی نسبت و تعلّق ہی سے جانا اور پہچانا ہوا تھا۔ وگرنہ ان پر کوئی پابندی باقی نہ رہی تھی۔ لہٰذا وفورِ شوق میں بیت اللہ کا طواف فرما لیتے۔ یہ قلبی و جذباتی تعلق اور روحانی و وجدانی نسبت ہی تو ایمان کی حقیقت ہے اور حقیقت میں ایمان ہے۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ تاریخِ اسلام کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ روشنی کا

مینار، معرفت کی بہار، طریقت و وفا، علم و حلم اور کردار و عمل کا ایک چراغِ نور۔ ہجرت کی رات شدید ترین خطرے کے باوجود، پورے اطمینانِ قلبی کے ساتھ، رسولُ اللہ (ﷺ) کے بستر پر لیٹے رہنا انہی کے حصہ میں آیا تھا۔ کہاں کا خوف؟ آج تو وہ عرش نشیں تھے۔ معاہدۂ حُدَیبیہ (۶ ہجری) کے موقع پر ان کے عرفان و وجدان کا ایک اور منفرد حوالہ سامنے آتا ہے۔ طے پایا تھا کہ معاہدے کا متن حضرت علیؓ تیار کریں گے۔ انہوں نے عبارت کے آغاز میں لکھا کہ یہ معاہدہ محمدؐ رسُولُ اللہ (ﷺ) اور اہلِ مکہ کے مابین ہے۔ اس پر کفارِ مکہ کی نمائندگی کرتے ہوئے سہیل بن عمروؓ نے اعتراض کیا۔ اس کا مؤقف تھا کہ اصل جھگڑا تو یہی ہے۔ جب ہم آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیں گے تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا یہ جملہ کاٹ دیا جائے۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ دیں۔ مگر انہیں اس ارشاد کی تعمیل میں تامل تھا۔ سیّد الثقلین نبی الحرمین (ﷺ) حضرت علیؓ کی جھجک کو فوراً سمجھ گئے کہ ان کا ذوق یہ گوارا نہیں کر رہا۔ آپ ﷺ نے ناراضی و خفگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ لیکن چونکہ حکمتِ خداوندی کے تحت صلحِ حُدَیبیہ آگے چل کر فتحِ مبین ثابت ہونے والی تھی اور اس بات کو آقا و مولا (ﷺ) ہی جانتے تھے۔ لہٰذا رسولِ پاک (ﷺ) نے معاہدہ کی دستاویز حضرت علیؓ سے لے کر اپنے ہاتھ سے ان الفاظ کو بدل دیا۔

غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ جیسے عظیم صحابی اور مزاج شناسِ رسول (ﷺ) نے اپنے آقا و مولا (ﷺ) کا یہ حکم کیوں نہیں مانا؟ اور مولائے انبیا (ﷺ) نے اسے حکم عدولی کیونکر نہ جانا؟ درحقیقت حضرت علیؓ کا بے پایاں عشق، اس کی اجازت نہ دیتا تھا اور محبت و عقیدت کے جذبات و احساسات کو

سرکار مدینہ (ﷺ) سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ کے قرینہ کی قدر فرمائی۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ بارگاہِ نبوی (ﷺ) میں ادب و احترام اور الفت و ارادت کے انداز بالکل نرالے ہیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے مالک بن نویرہ کو محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اس نے حضورِ اکرم شفیعِ معظم (ﷺ) کو "تمہارے ساتھی" کہا تھا۔ یہ بنو تمیم کا سردار تھا۔ اس نے امام الانبیا (ﷺ) کے وصال کے بعد زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ کو اس کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا کہ میں نماز تو پڑھوں گا، لیکن زکوٰۃ نہیں دوں گا۔ یہ غلط نہیں ہے اس لیے کہ تمہارے ساتھی (رسولُ اللہ) ایسا ہی کہتے تھے۔ حضرت خالدؓ نے کہا۔ "کیا رسول اللہ (ﷺ) ساتھی ہیں؟ اس نے پھر یہی جملہ کہا تو حضرت خالدؓ نے ضرارؓ بن ازواج کو حکم دیا اور انہوں نے اس کی گردن مار دی۔

صاحب الشفاء کہتے ہیں کہ ابراہیم بن حسین بن خالد الفقیہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کے اس عمل سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اگر کوئی تحقیر کے الفاظ بھی اپنی زبان سے نکالتا ہے تو وہ واجب القتل ہے۔

المختصر یہ گستاخیٔ رسالت ایک فتنہ ہے، سب سے بڑا فتنہ۔ گستاخ درحقیقت وطن، قوم اور دین کا قاتل ہوتا ہے۔ سب سے بڑا قاتل۔ اور فطری تقاضا ہے کہ اس نوع کے نشان تک مٹا کر رکھ دیئے جائیں۔ لہٰذا شاتمِ رسول (ﷺ) کا قتل پوری قوم کا فرض ہے ----- فرضِ عین ہے!

"مغزِ قرآں، رُوحِ ایماں، جانِ دیں"

موجودہ دور میں "شتمِ رسول (ﷺ) کا مسئلہ" بڑی شدّ و مد کے ساتھ زیرِ بحث آیا ہے اور یہ علماء کی صف سے نکل کر گویا عوام کا موضوع بن گیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب سلمان رُشدی کی رسوائے زمانہ کتاب شیطانی آیات (The Statanic Verses) کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ کذب و افتراء پر مبنی یہ ناپاک دفتر ۱۹۸۸ میں مرحلۂ اشاعت سے گزرا۔ ایک طرف تو مسلمانانِ عالم اس کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے اور شدید غم و غصّے کا اظہار کیا۔ جبکہ دوسری طرف چند بزعمِ خود دانشور و مبلّغ اپنا ہی راگ الاپ رہے تھے۔ ان کے عجمی فلسفے کا نچوڑ یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان نہ صرف یہ کہ دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ مسلسل طور پر دعوت کو قتل کرنے میں مشغول ہیں۔ انہی دعوت کُش سرگرمیوں میں سے ایک سرگرمی وہ ہے جو "شتمِ رسول (ﷺ)" کے خلاف مسلمان ہر جگہ جاری کیئے ہوئے ہیں۔ فرزندانِ اسلام کا اپنے آقا و مولا (ﷺ) کے ساتھ یہ جذباتی تعلق "ناقابلِ فہم" ہے۔ اس موضوع پر ایک صاحب لکھتے ہیں:

"مسلمانوں میں سے جو لوگ سلمان رُشدی کے قتل کی وکالت کر رہے ہیں وہ شتمِ رسول (ﷺ) کے مسئلہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں، گویا کہ یہ کوئی عام اور مطلق حکم ہے۔ یعنی یہ کہ جب بھی کوئی شخص، رسول (ﷺ) پر سبّ و شتم کرے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ از روئے مسئلہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص نہیں۔ اسی طرح اس کا تعلّق کسی ایک پیغمبرؑ سے بھی نہیں ہے بلکہ تمام پیغمبروں سے ہے۔ قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے ان میں سے کسی ایک پیغمبر پر سبّ و شتم کرنا فوراً آدمی کو گردن زدنی قرار دے دیتا ہے۔ اگر شتم کے اس مسئلہ کو صحیح مان لیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صدیوں سے تمام علماء اور تمام مسلمان حکمران

اس معاملہ میں مجرمانہ غلطی کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ بار بار سبّ و شتم کا واقعہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس مسئلہ پر عمل نہیں کیا، نہ علماء نے قتل کے فتوے دیے، اور نہ حکمرانوں نے ایسے لوگوں کو قتل کروایا۔ جن علماء اور فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ سبّ و شتم کرنے والا شخص واجب القتل ہے، وہ ان کے نزدیک صرف پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے لیئے نہیں ہے بلکہ خدا کے تمام پیغمبروں کے لیئے ہے۔ امام ابنِ تیمیہ نے اپنی کتاب میں ایک مستقل باب اس عنوان کے تحت قائم کیا ہے: "فصل فی ان حکم سب سائر الانبیاء کحکم سب نبینا علیہ السلام" اس باب کے تحت ابنِ تیمیہ نے لکھا ہے کہ تمام پیغمبروں کو سبّ و شتم کرنے کا وہی حکم ہے، جو ہمارے پیغمبر (ﷺ) کو سبّ و شتم کرنے کا حکم ہے۔ پیغمبروں میں سے جس پیغمبر کو بھی کوئی شخص سبّ و شتم کرے وہ کافر ہے اور اس کا خون حلال ہے۔ ایک طرف اس مسئلہ کو سامنے رکھیئے۔ دوسری طرف یہ دیکھیئے کہ فقہاء کے یہاں سبّ و شتم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کسی نبی کا اشارہ سے بھی تحقیر کرنا شتم میں داخل ہے۔ ایک مثال اس کو واضح کرتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی کہ رسولُ اللہ (ﷺ) کھانے میں کدّو کو پسند کرتے تھے اور اس کو رغبت سے کھاتے تھے۔ اس پر جماعت میں سے ایک شخص اٹھا اور اونچی آواز سے کہنے لگا کہ مجھے تو کدّو پسند نہیں۔ امام ابو یوسف نے اس کے اس کلام کو شتم قرار دیا اور اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ آخر کار اس شخص نے توبہ کی اور (حنفی مسلک کے مطابق) اس کی معافی ہوئی۔ اب اگر وہی مسئلہ ہو جو بظاہر اوپر کے بیان میں نظر آتا ہے تو علماء اسلام کو چاہیئے تھا کہ ایسے تمام شاتمین کے بارہ میں قتل کا فتویٰ دیں۔ اور پھر عام مسلمانوں سے یا مسلم حکومتوں سے یہ کہیں کہ وہ انہیں فوراً قتل کر دیں۔ مگر حال یا ماضی کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا۔ ایک مثال لیجیئے۔ مرزا غلام

احمد قادیانی نے بتکرار حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں واضح گستاخیاں کی ہیں۔ مثلاً اس کا ایک شعر یہ ہے:

ابنِ مریمؑ کے ذکر کو چھوڑو
اس سے بہتر غلام احمد ہے

رسولؑ پر اس سبّ و شتم کے باوجود مولانا (انور شاہ) کشمیری نے اور نہ دوسرے علماء نے یہ کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو قتل کر دو۔ قادیانی اپنے کھلے ہوئے سبّ و شتم کے باوجود زندہ رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت سے مر کے خدا کے یہاں پہنچ گیا"۔

مرقومہ بالا اقتباس میں کئی بنیادی، معلوماتی اور واقعاتی غلطیاں در آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شتمِ رسول (ﷺ) پہ سزائے موت کو جھٹلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ پیغمبروں پر سبّ و شتم کے مسئلہ کی روح اور اس کے تناظر کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں اس میں یہ تأثر دینے کی جسارت کی گئی ہے کہ گویا آغازِ اسلام سے لے کر اس صدی کی ابتدا تک علماءِ دین نے اس امر کا کبھی فتویٰ دیا، اور نہ ہی مسلم حکمرانوں نے اس نوع کا کوئی رویہ اختیار کیا ہے۔ اس پر مستزاد، بین السطور کچھ ایسا تأثر اجاگر کیا گیا ہے کہ جس سے معلوم ہو، تاریخِ اسلام میں جیسے معدودے چند علماءِ کرام ہی اس نقطۂ نظر کے حامی رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کدّو کے حوالے سے امام ابُو یُوسف کے ایک فتویٰ کا تذکرہ مسطور ہے، جس میں توبہ کو قبول کر لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حتمی طور پر قرار دے دیا گیا کہ ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ میں اس امر کی کوئی مثال دستیاب نہیں ہو سکتی۔ آخر مُسلمۂ پنجاب مرزا قادیانی کے بارے میں مولانا انور شاہ کشمیری وغیرھم کا ایسا کوئی فتویٰ نہ دینے کو دلیل ٹھہرایا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہم نے اس طرز کا

کوئی فتویٰ صادق کیا ہوتا تو کیا معترض و مخالف گُستاخِ رسول (ﷺ) کی سزائے قتل کے قائل ہو جاتے؟ حالانکہ دینِ اسلام کے ہر قابلِ ذکر فقیہ، محدّث، فقیہ، مجتہد، مفتی، مفسّر، محدّث اور محقّق و مصنّف نے روحِ دین کے بالکل عین مطابق گستاخئ رسالت کی سزا کے طور پر قتل و ہلاکت کو ہی تسلیم و تجویز کیا ہے۔ آئیے، اسلاف و اخلاف کے افکار و کردار کی روشنی میں "اس جدید گروہ" کے مَوقف کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

حضرت علی المرتضیٰؓ سے مروی ہے کہ رسولِ مکرم شفیع معظم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:۔ "جو شخص کسی نبیؑ کو گالی دے اسے قتل کر دو اور جو میرے کسی صحابیؓ کو گالی دے اسے کوڑے مارو"۔

الشفاء کا پورا نصف بتعریفِ حقوق المصطفیٰ (ﷺ) قلمبند ہوا ہے۔ ابو الفضل قاضی عیاضؒ نے اس میں موضوع سے متعلق ایک قابل قدر اور مدلّل و مستند سرمایہ و ذخیرہ جمع فرما دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ابوبکر بن منذر نے کہا ہے کہ عامہ اہلِ علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ جو شخص سرورِ انبیاء (ﷺ) کو گالی دے اسے قتل کر دینا چاہیئے۔ یہ بات حضرت مالکؒ بن انس، لیث، احمد اور اسحاق وغیرہم نے بھی کہی ہے۔ یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے"۔

"حضرت ابو بکر صدیقؓ کے قول کا بھی تقاضا یہی ہے (کہ اسے قتل کر دیا جائے) اور تمام علماء کے نزدیک اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی سفیان ثوری اہلِ کوفہ اور اوزاعی کا بھی یہی خیال ہے۔ البتہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمل ارتداد ہے (یعنی آپ (ﷺ) کی شان میں گستاخی کرنے والا مرتد کے حکم میں ہے)۔ اِسی بِنا پر ایسے شخص سے توبہ کرانے اور تکفیر کرنے کے مسئلے

میں اختلاف ہے کہ آیا کہ اس کو قتل کرنا حدِّ شرعی ہے یا محض تکفیر کافی ہے۔ البتہ اس معاملے میں ذرا اختلاف نہیں ایسا شخص مباح الدّم (جس کا مار ڈالنا جائز ہو) ہے۔ لیکن مشہور بات وہی ہے جو محمد بن سحنون کہتے ہیں کہ تمام علماءِ امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ شاتم النبیؐ یا وہ شخص جو آپ (ﷺ) میں نقص نکالے کافر اور مستوجبِ وعیدِ عذاب ہے اور پوری امت کے نزدیک واجب القتل ہے اور جو شخص ایسے شخص کے کافر اور مستحقِ عذاب ہونے میں کوئی شک کرے وہ خود کافر ہے"۔

"ابو سلیمان خطابی کہتے ہیں کہ میں مسلمان علماء میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو آپ ﷺ کو گالی دینے والے کو قتل کرنے کا قائل نہ ہو"۔ (جب کہ وہ مسلمان ہو۔ اگر کافر ہو تو اس کے لئے علیحدہ بحث ہے)

"ابن القاسم نے عتبہ میں لکھا ہے کہ جو نبیٔ اکرم (ﷺ) کو گالی دے یا آپ ﷺ پر عیب لگائے یا آپ ﷺ میں نقص نکالے، اسے قتل کیا جائے اور ساری امت کے نزدیک اس کو قتل کرنے کا حکم اسی طرح ہے جس طرح زندیق کو قتل کرنے کا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور (ﷺ) کی تعظیم و توقیر کو فرض قرار دیا ہے"۔

"مبسوط میں عثمان بن کنانہ سے مروی ہے کہ جو شخص مسلمان ہو کر حضور (ﷺ) کو گالی دے اسے قتل کیا جائے یا زندہ سولی دی جائے۔ اس کی توبہ قبول نہ کی جائے اور حاکم کو اختیار ہے کہ اس کو زندہ سولی دے یا اس کی گردن مار دے"۔

"ابو مصعب اور ابن ابی اویس کی روایت میں ہے کہ ہم نے امام مالکؒ سے سنا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ جو شخص حضورِ پاک (ﷺ) کو گالی دے یا بُرا کہے یا عیب لگائے یا آپ ﷺ پر کوئی نقص عائد کرے اسے قتل کیا جائے۔ چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔ اور امام احمد بن ابراہیم کی کتاب

میں ہے، امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص حضور (ﷺ) کو یا کسی اور نبی کو گالی دے اسے قتل کیا جائے اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان"۔

"اصبغ کہتے ہیں کہ ہر صورت میں اسے قتل کیا جائے، چاہے وہ اعلانیہ گالی دے یا خفیہ طور پر، اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے، کیونکہ توبہ کا حال معلوم نہیں"۔

"اشہب نے امام مالکؒ سے اور امام مالکؒ نے وہب سے روایت کی ہے کہ جس شخص نے یہ کہا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی چادر یا آپ ﷺ کی قمیص کی گُھنڈی میلی ہے اور اس سے اس کا ارادہ آپ ﷺ کی تحقیر کا ہو تو اسے قتل کیا جائے"۔

"ابو الحسن قابسی نے اس شخص کے بارے میں جس نے حضور (ﷺ) کے بارے میں یہ کہا کہ آپ ﷺ، حمّال (بوجھ ڈھونے والے) تھے۔ سرکارِ اقدس (ﷺ) کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ بازار سے سودا سلف خریدنے کے بعد خود اٹھا کر لاتے اور کسی کو نہیں پکڑاتے تھے۔ یا یہ کہے کہ آپ ﷺ، ابو طالب کے یتیم تھے تو فتویٰ یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے"۔ (کیونکہ وہ ایسا آپ ﷺ کی توہین کے ارادہ و نیّت سے کہتا ہے)

"قاضی عبداللہ بن مرابط نے کہا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ حضور (ﷺ) میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے تو اس سے توبہ کرائی جائے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک قسم کا عیب لگانا ہے۔ اور آپ ﷺ اس طرح کے عیوب سے مبرّا ہیں۔ آپ ﷺ کا ہر اقدام بصیرت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معصوم بنایا تھا"۔

"حبیبؒ بن ربیع فروی نے کہا ہے اور یہی امام مالکؒ اور ان کے شاگردوں کا

مسلک ہے کہ جو شخص نبیٔ اکرم (ﷺ) میں کسی قسم کا نقص نکالے اسے توبہ کرائے بغیر قتل کر دینا چاہیئے"۔

"ایسے ہی مَیں (قاضی عیاضؒ) کہتا ہوں کہ جو شخص آپ ﷺ کو حقیر جانے یا آپ ﷺ کو بکریوں کے چَرانے، سہو و نسیان اور جادو کے حملے یا آپ ﷺ کو زخم لگنے یا آپ ﷺ کے لشکر کی شکست یا دشمنوں کی ایذا رسانی یا آپ ﷺ پر مصائب و شدائد کے نزول یا عورتوں کی طرف آپ ﷺ کے میلان کے حوالے سے آپ ﷺ کو عار دلائے یا ہدفِ تنقید بنائے تو ان سب باتوں کا حکم یہ ہے کہ جو اِن باتوں سے آپ ﷺ میں نقص نکالنے کا ارادہ کرے وہ قتل کیا جائے"۔

ایک دفعہ حاکمِ کوفہ نے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز سے دریافت کیا کہ کیا میں اس شخص کو قتل کر دوں جو حضرت عمرؓ کو گالی دے؟ تو انہوں نے جواباً" لکھا تھا کہ گالی دینے کی بناء پر کسی مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں، البتہ جو کوئی رسول اللہ (ﷺ) کو گالی دے اس کا خون حلال ہے۔

کتب میں مرقوم ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک بار حضرت امام مالکؒ سے پوچھا تھا کہ جو شخص فخر الرسل (ﷺ) کو گالی دے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اور ساتھ ہی انہیں بتلایا کہ بعض عراقی فقہا کا فتویٰ ہے کہ اسے کوڑے مارے جائیں، تو امام مالکؒ غصہ ہو گئے اور فرمایا کہ اے خلیفۃ المسلمین! جو امت اپنی نبی کو گالی دے، پھر اس کا کیا ٹھکانا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان عراقی حضرات کا فتویٰ بالکل غلط ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام کو گالی دے اسے قتل کرنا چاہیئے اور جو نبیٔ اکرم (ﷺ) کے صحابہؓ کو گالی دے اسے کوڑے مارنے چاہئیں۔

ابو الفضل حضرت علامہ قاضی عیاضؒ مزید لکھتے ہیں:

"امام مالکؒ اور اوزاعیؒ سے شامی علماء نے یہی روایت کی ہے۔ یہی سفیان ثوریؒ امام ابو حنیفہؒ اور علماءِ کوفہ کی رائے ہے۔ اور، ایک دوسرا قول یہ ہے کہ حضور (ﷺ) کی شان میں گستاخی کفر کی دلیل ہے۔ لہٰذا حدِ شرعی کے تحت اسے قتل کیا جائے گا گو کہ اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ تاہم اگر وہ اپنی اس گستاخی اور دریدہ دہنی پر اصرار کرے اور اپنے فعل کو برا نہ جانے، نہ اس سے باز رہے تو وہ کافر ہے۔ اس کا قول صریح ہے"۔

توہین و تحقیر کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی، قصد و ارادہ ہے۔ دوسری، غیر ارادی لاشعوری طور پر۔ یہاں آخر الذکر صورت کا بیان مقصود ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو نتیجہ یہ برآمد ہو گا کہ بغیر نیت و ارادہ کے تحقیر و اہانت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی سبب ہے کہ علماءِ دین اور فقہاءِ امت نے قرآنی احکامات کی روشنی میں اس کا بھی دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس لیئے کہ یہ حسّاس موضوع کہیں بازیچۂ اطفال بن کر نہ رہ جائے۔ بات پھر وہی ہے کہ تحقیر و اہانت ہوتی ہی اس وقت ہے جب ارادہ شامل ہو۔ لہٰذا توہین و بے حیائی کا ارتکاب کرنے والوں سے کسی طور رعایت نہیں برتی جا سکتی۔

غیر ارادی طور پر توہین کے زُمرے میں رویّہ و عمل کی وہ قسم شامل ہے جس میں بغیر قصد و ارادہ کے پیغمبرِ اعظم (ﷺ) کی بے حرمتی کی جائے یا آپ ﷺ پر بہتان طرازی ہو۔ یا آپ ﷺ کی ذات بابرکات سے متعلق کسی طرح بھی کلمۂ کفر کہا جائے۔ (نعوذُ باللہ) تکذیب یا گالی کی راہ اختیار کی جائے یا آپ ﷺ کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو جائز نہیں ہیں یا آپ ﷺ کی ذات سے ایسی باتوں کی نفی کی جائے جن کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس نوع کے تمام افعال اگرچہ بقول کسی کے، قصداً" و اراداتاً" نہ کیئے جائیں اور چاہے نیت گستاخی کی نہ ہو۔ یا اس نے ذہنی اضطرار و انتشار یا جہالت و لاعلمی کی وجہ سے

کوئی کلمہ کہ دیا ہو یا لاپرواہی کے سبب ایسا کچھ سرزد ہو گیا ہو یا پھر قادر الکلامی نہ ہونے کی وجہ سے، حافظے کے نقص، دیدہ دلیری یا نشہ کی حالت میں اس طرح کا کوئی کلام صادر ہوا ہو تو ان تمام صورتوں میں وہی حکم ہے جو پہلی قسم کا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اسے تہِ تیغ کر دیا جائے۔ اس بات میں کسی قسم کی عُذر خواہی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

البتہ ایک صورت میں اسے معذور مان لیا جائے گا جب کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ بشرطیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ ثبوت اس کا یہ ہو گا کہ مجبوری و معذوری کی حالت سے باہر آتے ہی اس کی زبان سے اظہار ہو اور عمل گواہ بن جائے۔ تاریخِ اسلام میں اس کی ایک نظیر علماءِ اندلُس سے میسّر ہے۔ انہوں نے ابنِ حاتم کے بارے میں فتویٰ دیا تھا، جب کہ اس نے حضورِ پاک (ﷺ) کے زہد کی نفی کی تھی۔

لیکن حالت مجبوری و معذوری میں بھی ایسا کچھ کہنا غیرتِ انسانی سے فرو ترین ہے۔ موت برحق ہے اور بہرحال آ کر رہے گی۔ اس لیۓ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے بھی ایمان کی شان برقرار رکھے اور جان پر کھیل جائے تو یہ افضل ترین حوالہ ہے۔ تاہم زندگی میں کوئی مشکل ترین مرحلہ درپیش آ جائے جیسا کہ اندلُس میں مسلمانوں کو شامتِ اعمال سے اجتماعی طور پر بھُگتنا پڑا تھا، اور اس طرح اگر کوئی شخص دشمنوں کی قید میں ہو اور اس سے بالجبر توہین کروائی گئی تھی یا اس کو ارتداد پر مجبور کر دیا گیا تو اس وقت قتل کا حکم جاری نہیں ہو گا۔ لیکن صرف دشمنوں کے ہاتھ میں قید ہونا کوئی جواز نہیں ہے جیسا کہ محمد بن سحنون کا بھی فتویٰ ہے۔

خاکم بدہن، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر کوئی فرد ایسی پیچیدہ و نازک صورت حال سے دوچار ہو جائے اور پوری نسل کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوں تو اس سے قبل

اسے تبدیلی مذہب یعنی عیسائی یا ہندو وغیرہ ہو جانے کا اعلان کر دینا چاہیے، خواہ اس سے یہ تقاضا نہ کیا گیا ہو، مگر اپنے دل کو ایمان کی حالت پر قائم رکھے۔ یہ اس لیۓ کہ ایک مسلمان کا تصوّر مجروح نہ ہو اور اسلامی انفرادیت کا بانکپن زندہ و تابندہ رہے۔

اس بات میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں:

"ابو محمد بن ابی زید سے روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات (ﷺ) کے ساتھ گستاخی کرنے میں زبان کی لغزش کا عذر نہیں سنا جائے گا"۔

"ابو الحسن قابسیؒ نے ایسے شخص کے بارے میں بھی قتل کا فتویٰ دیا ہے جو نشہ کی حالت میں سرکارِ اقدس (ﷺ) کو گالی وغیرہ دے۔ کیونکہ اس شخص کے بارے میں گمان ہے کہ وہ اپنے قلبی اعتقاد کی بناء پر ایسا کر رہا ہے اور ہوش میں بھی وہ ایسا کرے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو قتل کرنا حد شرعی ہے اور حدِ شرعی نشے کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتی"۔

"امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامیذ کا مسلک یہ ہے کہ جو کوئی رسول اللہ (ﷺ) سے بیزاری ظاہر کرے یا آپ ﷺ کو جھٹلائے، وہ مرتد ہے۔ اور اس کا خون حلال ہے۔ الا یہ کہ وہ اپنی اس بات سے رجوع کرے"۔

"امام ابنِ قاسمؒ (امام مالکؒ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ جو (نسلی) مسلمان یہ کہے کہ حضور (ﷺ) نبی نہیں تھے یا رسول نہیں تھے یا ان پر قرآن نازل نہیں ہوا بلکہ یہ آپ ﷺ کے اقوال ہیں تو اس کو قتل کیا جائے اور جو شخص آپ ﷺ کی نبوت یا وجود کا انکار کرے حالانکہ وہ خود کو مسلمان کہتا ہو وہ مرتد کے قائم مقام ہے۔ اور ایسے ہی وہ شخص جو اعلانیہ آپ ﷺ کی تکذیب کرے"۔

ابنِ سحنون کا قول ہے کہ جو شخص رسولِ پاک (ﷺ) کی تکذیب کرے وہ پوری امت کے نزدیک واجب القتل ہے۔ یہی حکم اس کا ہے جو نبی بننے یا یہ کہے کہ

اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

الغرض مشتبہ انداز میں اہانت اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کسی کو تشبیہ دینے کے بارے میں بھی کُتُبِ فقہ میں احکام موجود ہیں۔ ان دو صورتوں میں جب کہ بات گول مول ہو، مطلب کے معیّن کرنے میں تردد آئے، بات میں ابہام پایا جائے، اور کھلم کھلا، نبیٔ اکرم (ﷺ) کی ذات مراد نہ ہو تو نیت و ارادہ کے رموز زیرِ بحث لائے جاسکتے ہیں۔ اور تعزیر یا حد کا فیصلہ حالات و واقعات، دلائل و براہین اور موقع محل کی مناسبت سے لاگو ہوتا ہے۔

مطلب یہ کہ حضورِ پاک (ﷺ) کی شان ارفع و اعلی میں اشارتاً، کنایتہ، "عمداً" قصداً" ادنی گستاخی و بے باکی بھی صریح کفر اور ایک ایسا جرم ہے جسے بطورِ حد لیا جاتا ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ لکھتے ہیں:

"حضور (ﷺ) کو گالی دینے والا اگر مسلمان ہو تو وہ کافر ہو جائے گا اور بغیر کسی اختلاف کے اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ائمۂ اربعہ کا یہی مذہب ہے"۔

امام ابنِ تیمیہ اپنی کتاب کے آغاز میں اہلِ علم اور ائمۂ مذاہب کے مسلک کا ذکر کرتے اور اس باب میں مزید لکھتے ہیں:

"جس نے بھی شانِ رسالت مآب (ﷺ) میں بے حرمتی کی، بالاتفاق وہ کافر ہے، اور اس کا قتل واجب"۔

ابن المنذر کہتے ہیں کہ تمام اہلِ علم اس بات پر متفق و متحد ہیں کہ حضور نبیٔ کریم (ﷺ) کی بارگاہ میں مرتکبِ گستاخی کی حد قتل ہے۔

ابوبکر الفاسی الشافعی کہتے ہیں کہ تمام اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ حضور رحمتٌ للعالمین (ﷺ) کی شان میں زبان دراز کرنے والے کی حد قتل ہے۔ جس طرح

کہ کسی اور کو گالی دینے والے کی سزا کوڑے ہیں۔ (اس اجماع کو انہوں نے صحابہ اور تابعین پر محمول کیا ہے)

امام اسحاق بن راھوَیہ کہتے ہیں کہ اس بات پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق و اجماع ہے کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے بارے میں زبان درازی کی، جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، اس میں کسی چیز کا انکار کیا، کسی نبی کو قتل کیا، وہ اپنے عمل سے کافر ہو جائے گا۔ (اور اس کی سزا بالاتفاق قتل ہے)

حنبل کہتے ہیں، میں نے ابو عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے رسول اللہ (ﷺ) کی شانِ اقدس میں زبان درازی کی یا تنقیص کا مرتکب ہوا مسلمان ہو یا کافر، اس کا قتل کرنا ضروری اور واجب ہو گا۔

عبداللہ اور ابو طالب کی روایت میں ہے، حضورِ اکرم (ﷺ) کے بارے میں زبان درازی کرنے والے کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ ان سے کہا گیا کہ اس بارے میں احادیث ہیں تو انہوں نے کہا، ہاں۔ اس بات میں احادیث وارد ہیں۔ ان میں سے ایک نابینا کی حدیث ہے جس نے ایک عورت کو قتل کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے اس عورت کو جنابِ رسولِ مقبول (ﷺ) کے بارے میں زبان دراز کرتے سنا تھا۔

حصین سے مروی حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں، جس نے نبیٔ کریم (ﷺ) کے بارے میں زبان درازی کی تو اسے قتل کیا جائے گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے، ایسے شخص کو قتل کیا جائے گا، اس لئے کہ جو نبیٔ کریم (ﷺ) کے بارے میں زبان درازی کرتا ہے، وہ مرتد ہے۔ اسلام سے خارج ہے۔ مسلمان کبھی حضورِ پاک (ﷺ) کی شان میں بے ادبی نہیں کرتا۔

عبداللہ کہتے ہیں، میں نے اپنے والدِ محترم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو سرکارِ مدینہ (ﷺ) کی شان میں بے ادبی کرتا ہے، آیا اس کو توبہ کرنے کے لئے کہا جائے گا؟ فرمایا، اس کا قتل واجب ہے اور توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایک ایسے آدمی کو تہِ تیغ کر دیا تھا، جس نے نبیٔ آخر الزماں (ﷺ) کی شان میں گستاخی کی تھی اور انہوں نے اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا۔

امام ابنِ تیمیہ قرآن و حدیث، عملِ صحابہ، علماءِ امت اور فقہاء و ملت سے یہی استنباط کرتے اور لکھتے ہیں:

"جو شخص نبیٔ کریم رؤف الرحیم (ﷺ) کو گالیاں دے، اسے توبہ کے لئے نہیں کہا جائے گا بلکہ اسے فوراً" قتل کر دیا جائے گا۔ جبکہ مرتد کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مرتد کو توبہ کرنے کے لئے تین دن کی مہلت دی جائے گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک توبہ کے لئے ملزم کو کہنا مستحب ہے"۔

بناء بریں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جو کوئی حقارتاً" کہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کی چادر مبارک میلی تھی یا آپ ﷺ کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے تحقیر کا پہلو نکلتا ہو تو وہ بدگوؤں میں شمار کیا جائے گا اور اس کے لئے بھی یہ سزا نافذ کی جائے گی۔

بتایا جاتا ہے کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا تم اُمّی (ان پڑھ) ہو۔ اس نے کہا اُمّی تو حضور ﷺ بھی تھے۔ اس پر امام مالکؒ نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر فرمایا۔

شفا شریف میں ہے کہ جو شخص ہادیٔ عالم (ﷺ) کی نعلین مبارک کے لئے بھی تحقیراً" کچھ کہہ دے وہ واجب القتل ہے۔

امام مالکؒ ان کے تلامذہ، سلفِ صالحین اور جمہور علماء کا یہ متفقہ قول ہے کہ ایسے شخص (شاتم) کو بطور حد کے قتل کیا جائے نہ بطور کفر کے، چاہے اس سے توبہ کا اظہار ہی کیوں نہ ہوا ہو، ان کے نزدیک کسی ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں کی جا سکتی۔ اپنے قول و فعل سے رجوع بھی اس کے حق میں مفید نہ ہو گا۔ ایسا شخص چاہے پکڑے جانے کے بعد توبہ کرے یا خود بخود توبہ کرتا ہوا آئے حد تو بہرحال اس پر نافذ ہو گی۔ اس لیے کہ توبہ کرنے سے حدود ساقط نہیں ہوا کرتیں۔

شیخ ابو الحسن قابسیؒ فرماتے ہیں کہ اگر شاتم الرسول ﷺ اپنے سبّ و شتم کا اقرار کرنے کے بعد توبہ کرے اور توبہ کے اثرات کا ظہور بھی ہو تو تب بھی بوجہ سبّ و شتم کے اسے ہلاک کیا جائے گا، کیونکہ یہ حد شرعی ہے۔

ابو محمد بن ابی زید کا معروف قول بھی یہی ہے۔ تاہم وہ یہ کہتے ہیں کہ توبہ اس کے اور اللہ کے درمیان معاملات کے سلسلے میں مفید ہو سکتی ہے۔

علماءِ اسلام و فقہاءِ امت کے نزدیک حضورِ پُرنور شافع یومُ النشور (ﷺ) کے بارے میں بے حرمتی کا معاملہ بڑا سنجیدہ اور بنیادی ہے۔ اس میں اختلاف کا تو تصور بھی روا نہیں رکھا گیا؟ کیونکہ یہ ہمارے آقا و مولا (ﷺ) کا حق ہے اور یہ آپ ﷺ کی وجہ سے اُمّت کا بھی حق ہے۔ اور حقوق توبہ سے ساقط نہیں ہو سکتے۔ البتہ اگر کوئی زندیق (ملحد / منکرِ خدا) ارتکاب گستاخی کرے اور پکڑا جائے تو امام مالکؒ اور امام ابُو یُوسُفؒ کا اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر پکڑے جانے سے قبل زندیق خود بخود آ کر توبہ کرے تو (بعض صورتوں میں) توبہ قبول کر لی جائے گی لیکن اگر وہ گرفتار ہو اور اس کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جا سکتی۔ پہلی شکل میں گنجائش اس لیے ہے کہ اس کا خود حاضر ہو کر اقرار کر لینا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے باطن میں جو کجی پیدا ہوئی تھی، وہ

درست ہو گئی ہے۔

قاضی ابو محمد بن نصرت، شاتم النّبی (ﷺ) کی توبہ قبول نہ کیئے جانے کے بارے میں ایک بہت ہی جاندار و شاندار دلیل لاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اُس شخص میں اور اُس شخص میں جو اللہ تعالیٰ کو گالی بکتا ہے (جس کی توبہ مشہور قول کے مطابق قبول کی جاتی ہے) یہ فرق ہے کہ نبیٔ اکرم شفیعِ معظم (ﷺ) بشر ہیں اور بشر ایسی جنس ہے کہ اسے نقصان لاحق ہو سکتا ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوت و رسالت کے ذریعہ فضیلت بخشی ہے۔ آپ ﷺ خاتم النّبیین اور عظمتِ بشر ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقصان سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ اور انسان کی طرح ایسا نہیں ہے کہ اسے کسی سے نقصان پہنچے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ رسولؐ اللہ (ﷺ) کو گالی دینا ارتداد کی طرح نہیں ہے جس میں کہ توبہ قبول کی جاتی ہے، کیونکہ ارتداد تو ایک ایسا گناہ ہے جس کا تعلق ایک آدمی کی ذات (مرتد) سے ہے۔ اس میں کسی دوسرے آدمی کا حق شامل نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی توبہ قبول کر لی جاتی ہے۔ مگر جس شخص نے حضورِ اکرم (ﷺ) کی شانِ اقدس میں بے حیائی کا مظاہرہ کیا تو اس نے ایک ایسا گناہ کیا جس سے نبیٔ محترم (ﷺ) کا حق متعلق ہو گیا (اور آپ ﷺ کی نسبت سے یہ پوری امت کا بھی حق ہے) اور وہ اس مرتد کی طرح ہو گیا جو مرتد ہونے کے وقت کسی کو قتل کر ڈالے یا کسی پاک دامن پر زنا کی تہمت لگا دے۔ اب اگر ایسا مرتد توبہ کرے تو کیا اس کی وجہ سے اس کے ذمہ جو قصاص عائد ہوا تھا یا جو قذف کی حد عائد ہوئی تھی، وہ ساقط ہو جائے گی؟ اور مسئلہ یہ ہے کہ مرتد اگر توبہ کرے تو اس سے چوری اور زنا کی حد ساقط نہیں ہوتی۔

حضورِ پاک (ﷺ) کو گالی دینے والا کفر کی وجہ سے تھوڑا ہی قتل کیا

جاتا ہے۔ وہ تو اس لیئے قتل کیا جاتا ہے کہ اس نے آپ ﷺ کی حرمت کو نقصان پہنچایا۔ اس لیئے اس نقصان کو دور کرنا ضروری ہوا اور توبہ اس سزا کو ساقط نہیں کر سکتی۔

غیر مسلم شاتم الرسول (ﷺ) کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ یا تو حربی ہو گا یا ذمّی ہو گا۔ حربی غیر مسلم تو ویسے ہی واجب القتل ٹھہرایا گیا ہے اور اگر وہ حضورِ پاک (ﷺ) کی شانِ زیبا میں ارتکاب گستاخی کرتا ہے تو پھر اس کا گردن زدنی ہونا مزید موکّد ہو جاتا ہے۔ اور اگر غیر مسلم ذمّی ہو گا تو شہنشاہِ کونین (ﷺ) کی ذات و صفات میں بے حرمتی کرنے سے اس کا عہد ٹوٹ جاتا ہے اور وہ واجب القتل قرار پائے گا۔

امام فخرالدین رازیؒ فرماتے ہیں:

"زجاج نے کہا کہ ذمّی جب دینِ اسلام پر طعن کرے گا تو اس کا عہد ٹوٹ جائے گا اور اس کو قتل کرنا واجب ہو جائے گا"۔

امام قرطبی، اپنی تفسیر جلد ۸ میں صفحہ ۸۳ پر لکھتے ہیں:

"ذمّی جب حضور (ﷺ) کو گالی دے یا کسی بھی طریقے سے آپ ﷺ کی قدر و منزلت کو کم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا"۔

احکاماتِ قرآنی، عہدِ رسالت و خلفائے راشدین کی نظائر، قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کا عمل و رویّہ اور چودہ صدیوں میں مشاہیرِ امت کے متواتر فتاویٰ کے بعد معترضین کا یہ قول بڑا احمقانہ ہے کہ اس پر مولانا انور شاہ کاشمیری نے مرزا غلام احمد قادیانی کے قتل کا فتویٰ نہیں دیا تھا۔ جب کہ مولانا موصوف کی رائے یہ ہے کہ ضروریاتِ دین کا منکر کافر ہے اور اس میں تاویل کرنے والا بھی کافر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعظیم کرنی اور توہین نہ کرنا ضروریاتِ دین سے ہے۔ مزید

برآں یہ کہ بارگاہِ انبیاء میں گستاخی کفر ہے، چاہے اس سے قائل کی مراد توہین کی نہ بھی ہو، انہی کا ایک فتویٰ ہے:

"کل اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی شان میں ناروا الفاظ کہنے والا کافر ہے اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے"۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے علاوہ علم و فقہ کے مہرِ تاباں، مہر الملّت، حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ نے بھی مُسیلمۂ پنجاب مرزا قادیانی کے بارے میں قتل کا فتویٰ صادر فرمایا۔ پیر صاحب فرماتے ہیں:

"معراج شریف کی نسبت قادیانی صاحب کا لکھنا کہ اس جسمِ کثیف کے ساتھ نہیں گئے تھے، سخت گستاخی اور بے ادبی ہے۔ گو کہ جسم شریف کی کثافت بہ نسبت روحِ مطہر ہی خیال کی جائے۔ قاضی عیاض 'شفاء' میں (اور) قاضی ثناء اللہ مالابُد میں لکھتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی نوع کی (صراحتہ" "اشارۃ" "عمداً" "سہواً") بے ادبی کا مرتکب بجنابِ نبوی (ﷺ)، بلکہ کل انبیاء علیہم السلام کی نسبت، خواہ مسلمان بھی کیوں نہ ہو، واجب القتل ہے"۔

مختصر یہ کہ تاریخِ اسلام کے اوراق پر حضور آقا و مولا (ﷺ) کے ساتھ لامحدود اور غیر مشروط وفاداری کے اَن گنت حوالے تابندہ ہیں۔ کیوں نہ ہو حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ کوئی شخص مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ پوری کائنات سے امام الامم (ﷺ) کو عزیز تر نہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ سے محبّت و اطاعت کی ایک ہی تو دلیل ہے اور وہ دلیل آپ (ﷺ) ہیں۔

گستاخِ رسُول کی شرعی سزا (ایک فتویٰ)

برِّصغیر پاک و ہند میں انگریزی اقتدار کے زیرِ سایہ باقاعدہ سازش کے تحت سرکارِ مدینہ (ﷺ) کی ذات والا صفات پر حرف گیری کا ایک سلسلہ شروع ہوا تو ۱۹۱۷ میں جونپور (بھارت) میں ایک واقعہ پیش آیا۔ سکولز کے طلبہ کو انگریزی کا ایک پرچہ حل کرنے کے لیئے دیا گیا جس میں ایسی عبارت ترتیب دی گئی تھی، جس کا انگریزی سے عربی ترجمہ کرانا مقصود تھا، اور اس انگریزی عبارت میں توہینِ رسول (ﷺ) کی گئی تھی۔ اس پر مسلمانانِ جونپور غم و غصّہ کی تصویر بن گئے۔ مولانا عبدالاوّل مرحوم (جونپوری) نے ٦ رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ کو امامِ اہلسنّت، مولانا احمد رضا خاں سے اس پر استفسار و فتویٰ چاہا۔ اس بارے میں اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی کا نقطۂ نظر فتاویٰ رضویہ۔ جلد ششم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شرعی دلائل اور غیرتِ اسلامی کا ایک شاہکار فتویٰ ہے، اور پوری اُمّتِ اسلامیہ کا ترجمان بھی۔ لہٰذا افادیت کے پیشِ نگاہ بلا کم و کاست نقل کیا جاتا ہے:

ان نام کے مسلمان کہلانے والوں میں جس شخص نے وہ ملعون پرچہ مرتّب کیا، وہ کافر مُرتد ہے۔ جس جس نے اس پر نظر ثانی کر کے برقرار رکھا وہ کافر مرتد، جس جس کی نگرانی میں تیار ہوا وہ کافر مرتد، طلبہ میں جو کلمہ گو تھے اور انہوں نے اس ملعون عبادت کا ترجمہ کیا، اپنے نبیؐ کی توہین پر راضی ہوئے، یا اسے ہلکا جانا، یا اسے اپنے نمبر گھٹنے، یا پاس نہ ہونے سے آسان سمجھا، وہ سب بھی کافر مرتد، بالغ ہوں، خواہ نابالغ۔

ان چاروں فریق میں سے ہر شخص سے مسلمانوں کو سلام کلام حرام، میل جول حرام، نشست برخاست حرام، بیمار پڑے تو اس کی عیادت کو جانا حرام، مرجائے تو

اس کے جنازے میں شرکت حرام، اسے غسل دینا حرام، کفن دینا حرام، اس پر نماز پڑھنا حرام، اس کا جنازہ اٹھانا حرام، اسے مسلمانوں کے گورستان میں دفن کرنا حرام، اسے ثواب پہنچانا حرام، بلکہ خود کفر و قاطع اسلام، جب ان میں کوئی مرجائے اس کے اعزّہ و اقرباء مسلمین اگر حکم شرع مانیں تو اس کی لاش دفعِ عفونت کے لیے مُردار کُتّے کی طرح بھنگی چماروں سے ٹھیلے میں اٹھوا کر کسی تنگ گڑھے میں ڈلوا کر، اوپر سے آگ پتّھر جو چاہیں پھینک پھینک کر پاٹ بھردیں کہ اس کی بدبو سے ایذا نہ ہو۔ یہ احکام ان سب کے لیے عام ہیں۔

اور جو ان میں نکاح کیے ہوئے ہیں ان سب کی جوروئیں (بیویاں) ان کے نکاحوں سے نکل گئیں، اب اگر قربت ہو گی حرام! حرام! حرام! اور زنائے خالص ہو گی، اور اس سے جو اولاد ہو گی ولد الزنا ہو گی، عورتوں کو شرعاً اختیار ہے کہ عدّت گزر جانے پر جس سے چاہیں نکاح کرلیں، ان میں جسے ہدایت ہو اور توبہ کرلے اور اپنے کفر کا اقرار کرتا ہوا پھر مسلمان ہو، اس وقت یہ احکام جو اس کی موت سے متعلق تھے، منتہی ہوں گے اور وہ ممانعت جو اس سے میل جول کی تھی جب بھی باقی رہیگی۔ یہاں تک کہ اس کے حال سے صدقِ ندامت و خلوص، توبہ و صحتِ اسلام، ظاہر و روشن ہوں۔ مگر عورتیں اس سے بھی نکاح میں واپس نہیں آسکتیں۔ انہیں اب اختیار ہو گا کہ چاہیں تو دوسرے سے نکاح کرلیں، یا کسی سے نہ کریں۔ ان پر کوئی جبر نہیں پہنچتا۔

ہاں! ان کی مرضی ہو تو بعدِ اسلام ان سے بھی نکاح کرسکیں گی۔

شفاء شریف صفحہ ۳۲۱

"یعنی اجماع ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والا کافر ہے اور اس پر عذابِ الٰہی کی وعید جاری ہے اور جو اس کے کافر و مستحقِ عذاب

ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہو گیا۔

نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ ۳۸۱ میں امام ابن حجر مکّی سے ہے۔

"یعنی جو یہ ارشاد فرمایا کہ نبی ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے والا کافر اور جو اس کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر، یہی مذہب ہمارے ائمہ و غیرہم کا ہے۔

"یعنی جو شخص معاذ اللہ مرتد ہو جائے اس کی عورت حرام ہو جاتی ہے، پھر اسلام لائے تو اس سے جدید نکاح کیا جائے، اس سے پہلے کلمۂ کفر کے بعد کی صحبت سے جو بچہ ہو گا، حرامی ہو گا۔ اور یہ شخص عادت کے طور پر کلمۂ شہادت پڑھتا رہے، کچھ فائدہ نہ دے گا جب اپنے اس کفر سے توبہ نہ کرے کہ عادت کے طور پر مرتد کے کلمہ پڑھنے سے اس کا کفر نہیں جاتا، اور جو رسول اللہ ﷺ یا کسی نبیؑ کی شان میں گستاخی کرے، دنیا میں بعدِ توبہ بھی اسے سزا دی جائے گی۔ یہاں تک کہ اگر نشہ کی بے ہوشی میں کلمہ گستاخی بکا، جب بھی معافی نہ دیں گے، اور تمام علمائے امت کا اجماع ہے کہ نبی ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کرنے والا کافر ہے اور کافر بھی ایسا کہ جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے"۔

فتح القدیر امام محقق علی الطلاق جلد چہارم صفحہ ۴۰۷ میں ہے۔

"یعنی جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا کینہ ہے وہ مرتد ہے، تو گستاخی کرنے والا بدرجۂ اولیٰ کافر ہے، اور اگر نشہ بلا اِکرہ پیا اور اس حالت میں کلمہ گستاخی بکا، جب بھی معاف نہ کیا جائے گا"۔

بحر الرائق جلد پنجم صفحہ ۱۳۵ میں بعینہ کلمہ مذکور ذکر کر کے صفحہ ۱۳۶ پر فرمایا۔

"یعنی کسی نبی کی شان میں گستاخی کرے، یہی حکم ہے کہ اسے معافی نہ دیں

گے اور بعدِ ثبوت اس کا انکار فائدہ نہ دے گا کہ مرتد کا ارتداد سے مکرنا تو دفعِ سزا کے لیے ہے، توبہ تو وہاں قرار پاتا ہے جہاں توبہ سنی جائے اور نبی ﷺ خواہ کسی نبی کی شان میں گستاخی اور کفروں کی طرح نہیں، اس سے یہاں اصلاً" معافی نہ دیں گے"۔

درر الحکام علامہ مولیٰ خسرو جلد اول صفحہ ۲۹۹ پر ہے۔

"یعنی اگر کوئی شخص مسلمان کہلا کر حضورِ اقدس ﷺ یا کسی نبی کی شان میں گستاخی کرے، اسے ہرگز معافی نہ دیں گے، اور تمام علمائے امت مرحومہ کا اجماع ہے، اس پر کہ وہ کافر ہے، اور جو اس کے کفر میں شک کرے، وہ بھی کافر ہے۔

غنیہ ذوالاحکام صفحہ ۳۰۱ میں ہے۔

"یعنی نبی ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی اور کفروں کی طرح نہیں، ہر طرح کے مرتد کو بعدِ توبہ معافی دینے کا حکم ہے، مگر اس کافر مرتد کے لیے اس کی اجازت نہیں"۔

الاشباہ والنظائر قلمی، باب الردۃ

ترجمہ: "یعنی نشہ کی بے ہوشی میں اگر کسی سے کفر کی کوئی بات نکل جائے اسے بوجہِ بے ہوشی کافر نہ کہیں گے، نہ سزائے کفر دیں گے مگر نبی ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی وہ کفر ہے کہ نشہ کی بے ہوشی سے بھی صادر ہوا تو اسے معافی نہ دیں گے، اور معاذ اللہ ارتداد کا حکم یہ ہے کہ اس کی عورت فوراً" اس کے نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اگر یہ بعد کو پھر اسلام لائے جب بھی عورت نکاح میں واپس نہ جائے گی اور جب وہ اسی ارتداد پر مرجائے، والعیاذُ باللہ تعالیٰ! تو اسے مسلمانوں کے مقابر میں دفن کرنے کی اجازت نہیں، نہ کسی ملت والے مثلاً یہودی یا نصرانی کے

گورستان میں دفن کیا جائے، وہ تو کتے کی طرح کسی گڑھے میں پھینک دیا جائے، مرتد کا کفر اصلی کافر کے کفر سے بدتر ہے، اور اگر کسی مسلمان پر گواہانِ عادل شہادت دیں کہ یہ فلاں قول یا فعل کے سبب مرتد ہو گیا اور وہ اس سے انکار کرتا ہو تو اس سے تعرض نہ کریں گے، نہ اس لیے کہ گواہانِ عادل کو جھوٹا ٹھہرایا، بلکہ اس لیے کہ اس کا مکرنا اس کفر سے توبہ و رجوع سمجھیں گے، ولہٰذا گواہانِ عادل کی گواہی اور اس کے انکار سے یہ نتیجہ پیدا ہو گا کہ وہ شخص مرتد ہو گیا تھا اور اب توبہ کر لی تو مرتد تائب کے احکام اس پر حاوی کریں گے کہ اس کے تمام اعمال حبط ہو گئے اور جورو (بیوی) نکاح سے باہر، باقی سزا نہ دی جائے گی۔ مگر نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کہ یہ وہ کفر ہے جس کی سزا سے دنیا میں بعدِ توبہ بھی معافی نہیں تھی اور نہ کسی نبیؑ کی شان میں گستاخی۔ علیہم الصلوۃ والسلام

فتاویٰ خیریہ، علامہ خیر الدین رملی استاذ صاحب دُرِّ مختار جلد اول صفحہ ۹۵ پر فرماتے ہیں۔

"جو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ کریمی میں گستاخی کرے وہ مرتد ہے، اس کا حکم وہی ہے جو مرتدوں کا ہے، اس سے وہی برتاؤ کیا جائے گا جو مرتدوں سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اسے دنیا میں معافی نہ دیں گے، اور باجماع تمام علمائے امت وہ کافر ہے اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔

مجمع الانہر، شرح ملتقی الابحر جلد اول صفحہ ۶۱۸ پر ہے

یعنی مسلمان کہلا کر حضورِ اقدس ﷺ یا کسی نبیؑ کی شان میں گستاخی کرے، اگرچہ نشہ کی حالت میں تو اس کی توبہ پر بھی دنیا میں اسے معافی نہ دیں گے۔ جیسے دہریے، بے دین کی توبہ نہ سنی جائے گی، اور جو شخص اس گستاخی کرنے والے کے کفر میں شک لائے گا، وہ بھی کافر ہو جائے گا۔

ذخیرۃ العقبےٰ، علامہ اخی یوسف صفحہ ۲۴۰ پر ہے

ترجمہ: "یعنی بے شک تمام امت مرحومہ کا اجماع ہے کہ حضورِ انور ﷺ، خواہ کسی نبی کی تنقیصِ شان کرنے والا کافر ہے، خواہ اسے حلال جان کر اس کا مرتکب ہو، یا حرام جان کر، بہرحال علماء کے نزدیک کافر ہے اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر۔

تنویر الابصار، شیخ الاسلام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ غزی

"ہر مرتد کی توبہ قبول ہے، مگر کسی نبی کی شان میں گستاخی کرنے والا ایسا کافر ہے، کہ دنیا میں سزا سے بچانے کے لیے اس کی توبہ بھی قبول نہیں"۔

کتاب الخراج سیدنا امام ابُویُوسُف ۱۸۲ پر ہے

ترجمہ: "یعنی جو شخص کلمہ گو ہو کر حضورِ اقدس ﷺ کو بُرا کہے، یا تکذیب کرے، یا کوئی عیب لگائے، یا شان گھٹائے وہ بلاشبہ کافر ہو گیا اور اس کی عورت نکاح سے نکل گئی"۔

اشخاصِ مذکورین کے کفر و ارتداد میں اصلاً شک نہیں، دوبارہ اسلام و رفع دیگر احکام، ان کی توبہ اگر سچے دل سے ہو، ضرور مقبول ہے۔ ہاں! اس میں اختلاف ہے کہ سلطان اسلام انہیں بعدِ توبہ و اسلام صرف تعزیر دے یا اب بھی سزائے موت دے۔

وہ جو بزازیہ اور اس کے بعد کی بہت کتبِ معتمدہ میں ہے کہ اس کی توبہ مقبول نہیں اس کے یہی معنی ہیں، اور اس کی بحث بیکار ہے۔ کہاں سلطانِ اسلام اور کہاں سزائے موت کے احکام، صدہا خبیث، اخبث، ملعون، انجس ہیں کہ کلمہ گو بلکہ اعلیٰ درجہ کے مسلمان، مفتی، واعظ، مدرّس، شیخ بن کر اللہ و رسول (ﷺ) کی جناب میں منہ بھر بھر کر ملعونات بکتے، لکھتے اور چھاپتے ہیں اور ان سے کوئی تو کہنے والا نہیں، اور اگر کہے تو نہ صرف ان کے بلکہ بڑے بڑے مہذب بننے والے مسلمانوں کے نزدیک، یہ بے تہذیبی و تشدّد ہو۔

نقش حیات

خداوندِ قدوس کو اپنے محبوب (ﷺ) کی بارگاہِ بے کس پناہ میں ذرا سی بے ادبی و بے حرمتی بھی گوارا نہیں ہو سکتی۔ کوئی ایسا لفظ، جس سے نبیِٔ آخر الزماں (ﷺ) کی ذاتِ بابرکات میں گستاخی کا ذرا سا شائبہ بھی ذہن میں پیدا ہو سکتا ہو، اس کا استعمال ممنوع و حرام ہے۔ بلکہ وہمِ تحقیر یا ذو معنی الفاظ، جو کسی طرح سے تنقیص و تعریض پر اشارتاً" بھی دلالت کرتے ہوں، انہیں کھُلا کفر قرار دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید میں حکم خداوندی ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا و قولو انظرنا واسمعوا وللکافرین عذاب الیم ○ (البقرہ، ۲:۱۰۴)

ترجمہ: (اے ایمان والو! تم "راعنا" نہ کہا کرو بلکہ "انظرنا" (ہماری طرف نگاہ توجہ فرمائیے) کہا کرو، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے)

گستاخی کا ارتکاب خواہ عمداً" ہو یا سہواً"، شعوری یا لاشعوری، ارادی ہو یا غیر ارادی طور پر اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ فرما دیا گیا۔ کیونکہ دین و ایمان کی بنیاد و اُساس نسبت و عظمتِ رسول (ﷺ) پر ہی استوار ہوئی ہے۔ توحید کا پہلا ثبوت بھی آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا تقدّس ہے۔ قرآن کی صداقت کا حوالہ بھی آپ ﷺ ہیں۔

تفسیرِ کبیر (۳:۲۲۴) کے مطابق حضرت سعدؓ بن معاذ نے ایک دن اچانک یہودیوں کو سرکارِ اقدس (ﷺ) کی جناب میں "راعنا" کا کلمہ کہتے سنا تو غضب ناک ہو کر ان سے فرمایا تھا: "اے دشمنانِ خدا! تم پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور قسم ہے مجھے اس ذات کی، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اب اگر تم میں سے کسی نے

رسول اللہ (ﷺ) کے لیے یہ کلمہ ادا کیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا"۔

فتح القدیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے: "صحابۂ کرامؓ نے اس آیۂ مبارکہ کے نزول کے بعد عہد کیا کہ اگر کسی سے گستاخی کا یہ کلمہ سنا تو اس کی گردن اڑا دیں گے"۔

سورۃ الحشر (۵۹:۳) میں ارشاد ہوتا ہے: "اور اگر اللہ نے ان (یہودیوں) کے لیے لکھ نہ دی ہوتی جلاوطنی تو دنیا میں ان کو سخت عذاب دیتا اور آخرت میں (تو) ان کے لئے آگ کا عذاب (تیار ہی) ہے"۔

اگلی آیہ میں دنیا و آخرت میں عذاب کا سبب' اللہ اور اللہ کے رسول (ﷺ) کی مخالفت و دشمنی کو اختیار کرنا بتایا گیا ہے۔

سورہ الانفال (۸:۱۲'۱۳) میں حکم باری تعالیٰ ہے: "پس تم ان کی گردن پر مارو اور ان کے پور پور پر۔ بایں سبب کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت (دشمنی) کرتا ہے تو بے شک اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے"۔

یہاں وجہِ قتل' مخالفت و دشمنی بتائی گئی ہے۔ اگر کسی بدبخت میں یہ علّت پائی جائے تو وہ واجب القتل ٹھہرتا ہے۔ اس رعایت سے مقامِ غور یہ ہے کہ آقائے مدنی (ﷺ) کی شان میں زبان دراز کرنے اور طعن و استہزاء سے بڑھ کر اذیّت کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اگر بنظرِ غائر دیکھیں تو ایذا کی دو صورتیں ہیں۔ قولاً" اور فعلاً"۔ بالقول اذیت اور بالفعل اذیت۔ اسی کو بالفاظِ دیگر روحانی و جسمانی اذیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دلچسپ امر یہ کہ جسمانی اذیت دینے والوں کے لئے توبہ و معافی کا باب مکمل طور پر وا تھا کہ وہ خلوصِ نیت کے ساتھ دائرۂ اسلام میں آئیں اور اپنے اپنے حصّہ کی برکت

پائیں مگر ذہنی و روحانی اذیت پہنچانے والوں کو مخصوص حالات میں ہی معاف فرمایا گیا۔ مدینہ کی اسلامی حکومت کے قیام کے بعد عموماً" ان کی گردن ماردی جاتی رہی۔

بناء بریں جسمانی اذیتوں کا سلسلہ تو رسولِ پاک (ﷺ) کے ظاہراً پردہ فرما جانے کے بعد کسی صورت جاری نہیں رہ سکتا تھا مگر روحانی تکلیف کا معاملہ اب بھی ممکن ہے۔ اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے وقتاً" فوقتاً" اس بارے میں ناپاک جسارتیں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا' فتحِ مکہ کے وقت ان کو تو عام معافی کا حق دار ٹھہرا دیا گیا۔ مگر جن بدطینت افراد نے افتراء و بہتان باندھے اور گستاخ ٹھہرے' ان مردودانِ ازلی کو غلافِ کعبہ سے لپٹ جانے کے باوجود مباح الدّم قرار دیا گیا۔

سورہ التوبہ (۹:۸۰) میں ارشاد ہے: "آپ ﷺ' ان کے لئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں (برابر ہے) اگر آپ ﷺ ان کے لئے ستّر بار بخشش طلب فرمائیں تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا' اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں عطا فرماتا"۔

اس حکم کی شانِ نزول میں رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی کی نمازِ جنازہ کا ذکر بھی بیان میں آتا ہے۔ جب سرکار رحمتؐ للعالمین (ﷺ) نے اس کی مغفرت کے لئے دعا فرمائی تو ارشاد ہوا کہ اے حبیب (ﷺ) چونکہ اس بدبخت و مردود نے جذبۂ اخلاص کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمتِ ناز میں حاضر ہو کر توبہ و معافی طلب نہیں کی' اس لئے آپ ازراہِ رحمت و شفقت ان کے لئے بخشش و مغفرت کی سفارش کریں یا نہ کریں برابر ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ ستّر بار اِن بے ادبوں

اور گستاخوں کے لیئے ہاتھ اٹھائیں اور دامن پھیلائیں تو میں پھر بھی ان کو نہیں بخشوں گا۔ مطلب یہ کہ آپ ﷺ تو سراپا رحمت ہیں اور جذبۂ رحمت سے مجبور بھی، کہ آپ ﷺ ان کی تمام تر خباثتوں اور عداوتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کے لیئے شفاعت کے طلبگار و امیدوار ہیں مگر میری محبّت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ جو آپ کی شان میں اپنی ناپاک زبان کھولے اس کو معاف کر دوں۔ مزید بر آں یہ کہ آپ ﷺ تو ہیں ہی مجسمۂ رحمت و محبّت۔ آپ ﷺ کو تو میں نے بھیجا ہی تمام جہانوں کے لیئے رحمت بنا کر ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز کے لیئے رحمت۔ چونکہ یہ آپ ﷺ کے دشمن ہیں لہٰذا میں انہیں کسی طرح بھی معاف نہیں فرماؤں گا۔ خواہ آپ ﷺ ہی ان کی بخشش کے لیئے دعا کیوں نہ کریں۔

قرآن شاہد ہے کہ حضور سرکارِ ہر عالم (ﷺ) وحی کی صورت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے۔ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے وہی ادا ہوتا ہے جو نازل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک مفہوم یہ ہوا کہ مولائے کائنات (ﷺ) کا کسی کو معاف فرمانا یا اس سے درگزر کرنا درحقیقت اللہ کا معاف فرمانا اور درگزر کرنا ہے اور اگر آپ ﷺ کسی کو حدّا" قتل کروا دیتے یا کوئی اور سزا تجویز فرماتے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیئے حکمتا" واضح فرما دیا کہ میرے محبوب و مطلوب رسولِ مقبول (ﷺ) کے گستاخ و بے ادب کے لیئے مغفرت و معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ بھی مشروط ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ اپنی زندگی میں آپ ﷺ کے پاس نادم ہو کر آئیں اور آپ ﷺ بھی ان کے لیئے معافی طلب فرمائیں تو اللہ بڑا ہی مہربان اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں منافقین کو جن کے قلوب میں بیماری (گستاخی و بے ادبی) تھی، اور وہ مدینہ المنورہ میں جھوٹی افواہیں اڑایا کرتے، تنبیہہ کی

گئی کہ اگر تم اپنی ان مذموم حرکتوں سے باز نہ آئے تو جلد ہی تمہیں جلا وطن ہونا پڑے گا اور توہین و تحقیر کے سبب سے تمہارے قتلِ عام کا حکم بھی صادر فرما دیں گے۔

اس بارے میں یہ بات بہرحال ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ تنبیہہ و سرزنش کا جواز اسلامی ریاست کے باقاعدہ قیام سے پہلے ہوتا ہے۔ جب دینی حکومت معرضِ وجود میں آگئی تو گویا یہ حجت مکمل ہو چکی ہے۔ جو لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں، وہ اسلامی ضابطہ سے انکار و فرار کا حق نہیں رکھتے اور جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں، وہ معاہد قرار پائیں گے یا پھر باغی۔ بغاوت کی شکل میں شہریوں کے جملہ حقوق از خود ساقط ہو جاتے ہیں اور اگر معاہد و ذمّی ہوں گے تو پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی ذات و صفات سے متعلق احترام و لحاظ کے پابند ٹھہرتے ہیں۔ اگر وہ قانونی ذمہ داریاں اور اخلاقی پابندیاں نہیں نبھاتے تو نقضِ عہد کے دستور میں جکڑ لیئے جائیں گے اور ان پر لازما" حد کا نفاذ ہو گا۔ گویا کہ اِس قرآنی حکم کے بعد کسی فرد کے لیئے بھی معافی کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیئے کہ اب یہاں تنبیہہ بجائے خود ایک موقع ہے۔ لہٰذا کسی کو مزید کوئی موقع فراہم نہیں کیا جا سکتا۔

اس باب میں عہدِ حاضر کے ایک عالمِ دین بڑا خوبصورت نکتہ بیان کر گئے ہیں۔ یہ ان دلائل سے ایک ہے جو نومبر ۱۹۸۵ میں وفاقی شرعی عدالت پاکستان کے روبرو دیئے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آیتِ کریمہ کے ذریعے ممانعت بذاتِ خود ایک موقع ہے۔ بقول ان کے: "منافقین بظاہر کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے جبکہ یہ اصلا" و نسلا" یہودی تھے۔ دنیوی مفادات کے حصول کے لیئے انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ ان کی شمولیت سے قبل، اسلام میں باقاعدہ جماعتِ منافقین کا وجود نہ تھا۔ صرف دو ہی طبقے تھے۔ ایک اہلِ ایمان اور دوسرے کافر و

مرتد۔ اہلِ ایمان میں سے کوئی فرد بشر گستاخی و اہانت کا ارتکاب کرے تو وہ اسی حد کو پہنچے گا۔ بایں وجہ قرآن میں اہانت و گستاخیٔ رسول (ﷺ) کے جرم کا حکم وارد ہو چکا ہے۔ گویا اب یہ آیۂ مقدسہ بذاتِ خود موقع و تنبیہ (Warning) بن گئی ہے۔ لہٰذا اب اس فعل کا مرتکب قطعی و حتمی طور پر سزا اور تعزیر ہی کا مستحق ہو گا۔

اگر وہ یہ کہے کہ اِس بار مجھے معاف فرما دیں۔ یہ میرا پہلا موقع ہے۔ میں اپنے گناہ سے تائب ہوتا ہوں۔ آیندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ اس طریق سے تو کبھی سزا کی نوبت نہیں آ سکتی۔ ائمہ و فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر توہین کی نوعیت، رسالت مآب (ﷺ) سے متعلق نہ ہو تو پھر "لئن لم نیتہ" کے تحت توبہ کا موقع دیا جائے گا۔ توبہ کرے تو معاف کر دیا جائے گا' وگرنہ قتل۔ لیکن اگر توہین و تنقیص کی نسبت، حضور نبیٔ اکرم (ﷺ) کی طرف ہو اور یہ عمل، اذیتِ رسول (ﷺ) کا باعث ہو تو اس بات کو پہلی سے مستثنیٰ کر کے فقہاءِ کرام کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں توبہ کا ہرگز موقع نہیں دیا جائے گا' بلکہ بطورِ حد قتل کیا جائے گا۔ ایسے بے ادب و گستاخ کی توبہ بھی سرے سے قبول ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ "وھی اعظم ارتداد" یہ ارتداد عظیم اور بہت بڑا ناقابلِ معافی گناہ (ناقابلِ تلافی جرم) ہے۔

امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی اس بات پر تصریح موجود ہے کہ اسے توبہ کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اور نہ ہی اس کی توبہ مقبول ہو گی۔ گویا وہ پہلی وارننگ کے بعد ہی ارتکابِ جرم کر رہا ہے۔

بناء بریں لفظ صریح میں تاویل کا دعویٰ قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ امام شہاب الدین خفاجیؒ قرآن و احادیث، عملِ صحابہ، اقوالِ ائمہ و علماء اور نظریاتِ فقہاء کے مجموعی مزاج کے بیان میں لکھ گئے ہیں کہ توہین رسالت پر حکمِ کفر کا مدار (چونکہ ظاہری الفاظ پر ہے۔ لہٰذا توہین کرنے والے کے ارادہ و نیت اور اس کے قرائنِ حال کو

نہیں دیکھا جائے گا۔

اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ از رُوئے دینِ متعین حدود میں عذر و معافی کی مطلقاً" گنجائش نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ اگر یہ طریق کار روا ٹھہرا دیا جاتا تو پھر اہانت و گستاخی کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر گستاخِ رسول (ﷺ) یہ کہہ کر بچ نکلتا کہ میں نے اِس اِمر کا کوئی ارادہ نہیں کیا اور نہ ہی میری توہین کی نیّت تھی۔ چونکہ خداوندِ کریم کو ہر طرح کی شماتت کی بیخ کنی منظور تھی اور کُلیتاً" اس کے انسداد و اختتام کے لئے ضروری قرار پایا کہ یہ جرم صریح ہو یا غیر صریح، خفی ہو یا جلی' ارادی ہو یا غیر ارادی، مسلم سے ہو یا غیر مسلم سے، نہ تو اس میں تاویل و توجیہ جائز ہے اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی حیلہ و عذر۔ بایں وجہ ایسے بدکردار کی سزا حداً" تجویز کی گئی تاکہ حضور خاتم المرسلین (ﷺ) کے حوالہ سے بے حیائی و بے وفائی کا مرض پیدا ہی نہ ہو پائے۔

فقہِ حنفی کی معتبر و مستند کتب میں یہ منشور و دستور بالفاظ ذیل درج ہے: "جو مسلمان مرتد ہوا' اس کی توبہ قبول کی جائے گی' سوائے اس کافر و مرتد کے جو انبیاءؑ میں سے کسی بھی نبی کو گالی دے۔ اس صورت میں وہ حداً" قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ مطلقاً" قبول نہیں کی جائے گی"۔

"احکامِ اسلام اور تحفظِ ناموسِ رسالت" کے موضوع میں ایک سوال یہ بھی زیرِ بحث آیا ہے کہ کیا گستاخِ رسول (ﷺ) کی توبہ قبول ہے؟ گستاخِ رسول (ﷺ) کی توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کے متعلق چند سوالات لازمی طور پر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں' اس سے منظر نامہ کچھ یوں بنتا ہے۔

○ یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جو توہینِ رسالت کا مرتکب ہو وہ کافر و مرتد ہے اور حداً" قتل کی سزا کا مستحق ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا فرد توبہ کی

طرف مائل ہو تو کیا اس کے لیئے کوئی رعایت ہے یا نہیں؟

○ اگر اس کے لیئے توبہ کی کوئی صورت ہے تو کیا مواخذہ (گرفتاری یا مقدّمہ) سے پہلے کی توبہ قبول ہو گی یا بعد الاخذ، یعنی گرفتاری اور مقدمہ دائر ہونے کے بعد کی مقبول ہے؟

○ اس باب میں آخری اور لازمی سوال یہ ہے کہ شاتمِ رسول (ﷺ) کی قبولیتِ توبہ کا معنیٰ کیا ہے؟ عند اللہ، عند الناس یا عند القانون؟ اور یہ کہ کیا یہ توبہ گناہ کی معافی کے لیئے متصوّر ہو گی یا جرم بھی معاف ہو سکتا ہے؟ مرقومہ بالا رسالے کے فاضل مصنف واضح کرتے اور لکھتے ہیں کہ تمام فقہی مذاہب کی آراء، فقہاء کی تصریحات اور اہلِ علم کی تحقیقات کو سامنے رکھ کر یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ اس مسئلے پر کل تین آراء ہیں اور فی الواقع وہ تین بھی نہیں بلکہ دو ہی بن جاتی ہیں۔ پہلا مَوقف ہے کہ توبہ مطلقاً" قبول نہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ توبہ "قبل الاخذ" قبول ہے۔ الغرض نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے۔

○ ملتِ اسلامیہ میں شاتمِ رسول (ﷺ) کے حدا" واجب القتل ہونے میں سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔

○ اس بات پر بھی اجماعِ امت ہے کہ بعد الاخذ یعنی مقدمے کے اندراج و گرفتاری کے بعد توبہ قطعا" قبول نہیں ہو گی۔ اور شاتم بہرصورت میں مباح الدّم ہے۔

○ اب اختلافِ رائے کا دائرہ سکڑ کر انتہائی محدود رہ جاتا ہے۔ بالاتفاق مذاہبِ اربعہ (حنابلہ + شوافع + احناف + مالکی) مقدمہ و گرفتاری ہو جانے پر توبہ قطعا" قابلِ اعتبار نہیں رہے گی۔

یوں ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ اگر اندراجِ مقدمہ و گرفتاری سے قبل توبہ ہو تو بعض شرائط کے تحت معافی مل سکتی ہے۔ لیکن اس مسئلے پر مذاہبِ

اربعہ کے ائمہ و فقہا کی تقسیم کچھ اس طرح ہے۔ مالکی و حنبلی مکمل طور پر پہلے نقطۂ نگاہ کے حامی ہیں۔ جبکہ حنفیوں میں چند ایک کے علاوہ غالب اکثریت اور اسی طرح شافعیوں میں اکثر پہلے موقف کے موید ہیں۔ گویا کہ من حیث المجموع امت کے جملہ ائمہ و فقہا کے چار حصوں میں سے ایک حصہ بمشکل دوسری رائے کا حامی نظر آتا ہے۔ مطلب یہ کہ مذاہبِ اربعہ کے ائمہ و فقہا کے تین حصے اس پر باہم متفق ہیں کہ گستاخِ رسول (ﷺ) لازمی طور پر واجب القتل ہے۔ اور اس کی توبہ کسی بھی صورت میں قبول نہیں۔ ایک چوتھائی کا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل تین شرائط کے ساتھ توبہ قبول کی جا سکتی ہے۔

☆ (i) صحتِ توبہ ☆ (ii) حسنِ اسلام ☆ (iii) اصلاحِ احوال

کتبِ فقہ میں ان شرائط کی حدود و قیود بالتفصیل درج ہیں۔ اور ائمہ ان کی تکمیل کے لیئے جزئیاتی تفصیلات میں گئے ہیں۔ تیسرا مَوقف یہ ہے کہ بصورتِ توبہ، حدا" قتل کے بعد احکامِ اسلامی کا اجراء ہو گا۔ یہ دراصل پہلے مَوقف کی تائید ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے مَوقف کے حامیوں کے نزدیک "قبل الاخذ" قبولیتِ توبہ کا مفہوم، عند اللہ مقبولیت کا ہے، عند الناس قبولیت مراد نہیں۔ اس کی توبہ سے آخرت کی سزا و عقوبت تو مرتفع ہو جائے گی۔ مگر توبہ سے حدِ قتل قطعا" ساقط نہیں ہو گی۔ جبکہ مَوقفِ ثالث کی رو سے قبل الاخذ عند اللہ قبولیتِ توبہ سے اس شخص کو یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ سزائے موت کے بعد اس پر احکامِ اسلام کا اجراء ہو گا۔ نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی۔ تکفین و تدفین میں بھی اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ درحقیقت تیسرا موقف بھی پہلا مَوقف ہی بن جاتا ہے۔ بایں وجہ اس میں بھی قبولیتِ توبہ کو اسقاطِ قتل کے ساتھ متعلق نہیں

کیا گیا بلکہ قبولیتِ توبہ کا تعلق عند اللہ مقبولیت کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس کے وقتِ موت مسلم، غیر مسلم ہونے کے ساتھ مختص ہے۔ کیونکہ اسی بناء پر تو فیصلہ کیا جائے گا کہ کیا اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جائے اور اس کی تکفین و تدفین کی جائے یا نہ کی جائے۔ پہلے اور تیسرے موقعہ میں یہی بات قدرِ مشترک ہے کہ سزائے موت کسی بھی صورت میں مرتفع نہ ہو گی۔ بہرصورت اس کا نفاذ ہو گا۔ سو اس اعتبار سے تیسرا مَوقف بھی حقیقتاً" پہلا موقف ہی قرار پاتا ہے"۔

الغرض پہلے موقف کی تائید و توثیق میں ائمہ و فقہا کے لاتعداد اقوال موجود ہیں۔ ان میں امام مالکؒ، امام احمدؒ بن حنبل، قاضی ابو یعلیؒ، ابنِ تیمیہ، امام ابو المواہب العکبری، قاضی الشریف ابو علی بن ابی موسیٰؒ، امام ابو علی بن البنامہؒ، امام ابوبکر بن المنذرؒ، امام ابن الہمامؒ، امام برہان الدین محمودؒ، امام ابنِ عابد بن حنفیؒ، امام خیر الدین رملی حنفیؒ، قاضی عیاضؒ، امام ابن غنم حنفیؒ، امام ابنِ بزار حنفیؒ، امام حصکفیؒ، امام عثمان بن کنانہ مالکیؒ، امام اصبغ مالکیؒ، شیخ ابوبکر الفاسیؒ، امام عبداللہ بن الحکم فقیہ مصریؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی وغیرہم بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ امام اصبغ مالکیؒ نے شاتمِ رسول (ﷺ) کے متعلق بالصراحت فرمایا ہے۔ "گستاخِ رسول (ﷺ) کو بہرصورت قتل کیا جائے گا۔ خواہ وہ گستاخی کو چھپائے یا ظاہر کرے، اس کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ اس کی توبہ قبول کرنے کی کوئی مثال پائی ہی نہیں جاتی۔ مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ بعض ائمہ نے "قبل الاخذ" توبہ کی جو صورت بیان کی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے گستاخِ رسول (ﷺ) کو بھی عام مرتدین کے درجے میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ اس میں بعض بنیادی سقم ہیں۔ اگر یہ مسلمانوں میں سے ہو گا تو پھر ارتداد کا دائرہ بجا، لیکن بالفرض وہ غیر مسلموں میں سے ہو تو پھر ارتداد کا حکم کیا معنی؟ ظاہر ہے کہ اس نے تو اسلام قبول ہی نہیں کیا تھا، وہ مرتد

کیونکر گنا جائے گا۔ صاف اور سیدھی بات ہے یہ ہر ایک سخت ترین ریاستی و انسانی جرم ہے اور اس پر ازروئے دینِ مبین سزائے موت مقرر ہے۔ چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ اور اس میں تبدیلی و معافی کا کسی کو حق نہیں دیا گیا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اُندلس میں ایک موقع پر حکومتی مصالح کے تحت مفتیان و قاضیان نے شاتمان و گستاخانِ رسول (ﷺ) کے بارے میں رواداری اور تحمل و درگزر کا رویہ اپنا لیا اور ان کی معذرت و توبہ قبول کر لینے کے فتاویٰ صادر کیے تھے۔ ہوا یہ کہ بدبخت و بدنہاد عیسائی باقاعدہ ایک تحریک کے زیرِ اثر توہین و بے ادبی کا ارتکاب کرتے اور عدالت میں معافی نامہ لکھ دیتے اور احساسِ شرمندگی ظاہر کر کے بچ جاتے تھے۔ دوسرے دن اس کی جگہ ایک اور شاتمِ نبی (ﷺ) شہر کے چوراہے میں آتا اور اپنی غلیظ زبان سے شانِ رسولِ مقبول (ﷺ) میں گستاخی کی جسارت کرتا۔ یوں یہ روز مرّہ کا معمول ہو گیا تھا اور دھیرے دھیرے اہلِ اسلام کے قلوب و اذہان بھی اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ وہ خطۂ ارض جس پر قریباً" سات صدیوں تک مسلمانوں نے جہانبانی و حکمرانی کا حق ادا کیا، وہاں اب ڈھونڈے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا۔ بایں سبب جذبۂ عشقِ رسول (ﷺ) فرزندانِ اسلام کے لئے نسخۂ کیمیا اور نقشِ زندگی ہے۔ تحفظِ ناموسِ رسالت سے منحرف ہو جانا ان کی موت اور اس میں غیور و جسور ہونا حقیقتاً حیاتِ جاودانہ ہے۔

مُرتد و شاتم

دینِ اسلام، عقائد و نظریات کی رو سے ایک نظامِ فکر ہے۔ اس کا اپنا مزاج اور ضابطۂ حیات ہے۔ یہ میانہ روی اور اعتدال کا دین ہے۔ اس کے ہر حکم میں

حکمت و استدلال پنہاں ہے اور ہر عمل سے دانش و بینش عیاں۔ اسلام کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں' (لا اکراہ فی الدّین) کیونکہ ہدایت' گمراہی سے متمیّز ہو چکی ہے۔ یہ رِضا و رغبت کا معاملہ ہے۔ اسلام میں اس کے لیئے تشدّد کو قطعی طور پر روا نہیں رکھا گیا۔ ہر فرد کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے طبعی رجحان کے موافق کوئی سا دین اپنائے۔ تفکّر و تدبّر کے تمام دروازے کھلے رکھے گئے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے اجتماعیت کے منشور اور فلاحِ انسانیت کے دستور کا حامل ہونے کی وجہ سے اپنے ماننے والوں کو غیر سنجیدگی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی معاشرے میں ہر شخص محترم ہے۔ اس کی عزت' جان اور مال کی حفاظت کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

مسلم ریاست میں ایک غیر مسلم کے بنیادی حقوق بھی دیگر شہریوں کی طرح ہیں۔ آزادئ فکر و عمل' آزادئ مذہب و عقیدہ اور آزادئ معاش و پیشہ۔ ضابطۂ قرآنی کے مطابق احکاماتِ الٰہیہ سے عہدِ وفا کو "ایمان" کہا گیا ہے اور اس کے برعکس رَوِشِ فکر و طرزِ زندگی کا نام کفر ہے۔ حق' ہر رنگ اور ہر آہنگ میں باطل سے ممتاز اور نکھرا ہوا ہے۔ اب جس کا جی چاہتا ہے ایمان لائے یا کفر اختیار کرے۔ اس باب میں کوئی جور' زیادتی یا استبداد نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یوں ہوتا تو رُوئے زمین کا فرد فرد ضرور ایمان لاتا۔ یہاں تک کہ حالتِ جنگ میں بھی جبر و اکراہ سے مسلمان بنانے کی اجازت عطا نہیں فرمائی تھی۔ اس لیئے کہ اعماقِ ایمان کا تعلق صریحاً" انسان کے قلب و باطن سے ہے۔ یہ یکسر روح کا معاملہ ہے۔ لہٰذا جب تک اطمینانِ دل میسر نہ ہو گا کوئی ایمان کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیئے غلبۂ اسلام یعنی فتوحات سے متاثر ہو کر ایمان لانے والوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنے آپ کو مومن مت کہو کہ ہنوز' ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔ تم تو محض مسلمان ہوئے ہو۔ اسی طرح فرمایا گیا کہ اگر کسی مسلمان سے زبردستی اقرارِ کفر کروالیا جائے' در

آنحالیکہ اس کے من کی دنیا' ایمان سے مطمئن تھی تو اسلام سے جبری انکار اسے کافر نہیں ٹھہراتا۔

قرآنِ پاک (التوبہ:۲) "پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں' اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی آیات اس قوم کے لیئے' جو علم رکھتی ہے اور اگر یہ لوگ توڑ دیں اپنی قسمیں اپنے معاہدہ کے بعد اور طعن کریں تمہارے دین پر تو جنگ کرو کفر کے پیشواؤں سے۔ بے شک ان لوگوں کی کوئی قسمیں نہیں ہیں۔ (ایسوں سے جنگ کرو) تاکہ یہ لوگ (عہد شکنی سے) باز آ جائیں"۔

اس آیۂ کریمہ کے باب میں موجودہ دور کے بعض اہلِ قلم بے جا طور پر دور کی یہ کوڑی لاتے اور بتاتے ہیں کہ یہ مرتدین کے بارے میں نہیں بلکہ ان غیر مسلموں کے بارے میں ہے جو عہد شکنی کر کے مملکت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بقول ان کے "یہ وہ اصول ہے جس کی تصریح قرآن نے متعدد مقامات پر کی ہے۔ یہی صورت سن ۹ ہجری میں کفّارِ مکّہ کے معاملہ میں پیش آئی۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ ان کے لیئے دو صورتیں ہیں: (i) یہ لوگ یا تو مسلمان ہو کر مملکتِ اسلامیہ کا جزو بن جائیں (ii) یا غیر مسلم رہتے ہوئے امن و سلامتی کے معاہدے پر کاربند رہیں۔

پھر اگر یہ لوگ اس معاہدے کی پابندی نہ کریں تو اس صورت میں اس کے سوا چارہ نہ ہو گا کہ ان سے جنگ کی جائے۔

یہ لوگ نکتہ سنجی کے جوش میں بھول جاتے ہیں کہ فان تابو۹ کا حکم وارد ہوا ہے کہ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور قیامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند ٹھہریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ یہاں اگر کفر سے توبہ مراد لی جائے: تو لا اکراہ فی الدین کے فلسفہ کی

تکذیب کا تاثر ابھرتا ہے۔ لہٰذا عهدهم کے معنی کفّار کا اقرارِ اسلام ہی لیا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دینِ حق کی قبولیت کے لیئے کفار پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تاہم ایک بار دائرہِ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد نکل جانے کو بوجوہ قابلِ گرفت جرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ بند کر دینے میں کئی مضمرات ہیں اور اگر یہ کھلا رکھا جاتا تو کئی ناقابلِ تلافی مضرات تھے۔ لیکن ان صفحات میں اس پر سیر حاصل تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ارتداد کا فعل انفرادی نوعیت کا ہو تو تادیبی حکم مختلف ہے لیکن اجتماعی حیثیت میں ہو تو حکمِ تادیب جدا ہے۔

مرتد کی سزا پر بھی اجماعِ امت ہے۔ یہاں تک کہ عہدِ حاضر کا ایک مغرب گزیدہ مسلمان مولانا وحید الدین خاں بھی اس کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ تبھی تو انہوں نے لکھا۔ "مرتدین کا مقابلہ تلوار ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ خلیفۂ اول ابوبکر صدّیقؓ نے کیا۔ مگر سَبّ و شتم کرنے والوں کا مقابلہ یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا جواب زیادہ طاقتور الفاظ سے دیا جائے جیسا کہ حسّان بن ثابت انصاریؓ نے کیا اور کامیاب ہوئے۔ اس مثال سے مرتد اور شاتم کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے"۔

میرا نقطۂ نگاہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ میں ان کا اس امر میں تو ہم خیال ہوں کہ ارتداد اور شتم کو ہم معنی قرار دینا بذاتِ خود ایک غلط قیاس ہے لیکن شاتم سے متعلق ان کے بالکل برخلاف رائے رکھتا ہوں۔ راقم الحروف کی یہ کوئی ذاتی رائے ہرگز نہیں۔ واقعی، رسول (ﷺ) کا سبّ و شتم ارتداد کے ہم معنیٰ نہیں ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ موصوف نے یہ بھی بالکل غلط قیاس کیا ہے کہ اس معاملہ میں سب سے عام استدلال یہ ہے کہ حدیث میں یہ حکم آیا ہے کہ جو شخص اپنے دین کو بدل ڈالے اس کو قتل کر دو (من بدل دينه فاقتلوه) کہا جاتا ہے کہ چونکہ رسول (ﷺ) کا سبّ و شتم ارتداد کے ہم معنیٰ ہے، اس لیئے ایسا

فعل کرنے والا مرتد ہو گیا۔ اور جب وہ مرتد قرار پا گیا تو حدیث کے مطابق وہ اس کا مستحق ہو گیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

مرتد، لغت میں لوٹ جانے والے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ارتداد کا مطلب ہوا، لوٹنا۔ جبکہ اصطلاحِ فقہ میں اسلام چھوڑ دینے اور دین سے پھر جانے کو ارتداد کہتے ہیں۔ ارتداد کا ایک رکن بدنیتی ہے اور دوسرا رجوع عن الاسلام۔ "التشریع الجنائی" میں اول الذکر کے بارے میں باقاعدہ ایک باب باندھا گیا ہے۔ تحریر ہے: "جرمِ ارتداد کے وجود کے لیئے ضروری ہے کہ مجرم عمداً" کلمۂ کفر کہے یا عملِ کفر کا ارتکاب کرے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص نادانی میں کلمۂ کفر کہہ دے یا لاعلمی میں عملِ کفر کا ارتکاب کر دے تو وہ شرعاً" مرتد نہیں ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کے کہے ہوئے کلمۂ کفر کو نقل کرے اور خود اس کا معتقد نہ ہو تو وہ بھی مرتد نہ ہو گا۔ یا شدّتِ حُزن یا شدّتِ سُرور میں بے ساختہ کوئی کلمۂ کفر نکل جانے سے بھی آدمی مرتد نہیں ہوتا۔ کلمۂ کفر کہنے یا عملِ کفر کا ارتکاب کرنے میں نیت ہونا ضروری ہے۔ یہ مسلک اصحابِ ظواہر کا ہے"۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عمداً" فعلِ کفر یا کلمۂ کفر بکنے سے آدمی کافر و مرتد ہو جاتا ہے، خواہ اس کی نیت مرتد ہونے کی ہو یا نہ ہو۔ مثلاً عمداً" اگر کوئی شخص شریعت کا مذاق اڑائے یا احکامِ شریعت کی تحقیر کرے تو خواہ وہ مرتد ہونے کی نیت نہ کرے، مرتد ہو جائے گا۔

حضور اقدس (ﷺ) کے کسی حکم کی تعمیل یا سُنّت کی پیروی نہ کرنا بدنصیبی اور تساہُل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص، آپ کے کسی حکم یا سنّت کی تحقیر و اہانت کرے تو یہ بے حیائی، ڈھٹائی، بے وفائی، خُبثِ باطن، فتنہ پروری اور بے غیرتی ہے۔ کُھلا کفر اور زندیقی ہے۔

ایک مقام (سورہ النحل: ۱۰۶) پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کرے مگر یہ کہ وہ مجبور کر دیا گیا ہو۔ (محض زبان سے کلمۂ کفر کہا ہو بشرطیکہ) اس کا دل ایمان پر قائم ہو (تو یہ قابلِ مواخذہ نہیں ہے) مگر جو شخص کھلے دل کے ساتھ اللہ کے ساتھ کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہو گا اور ان کو بڑے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا“۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے: ”رسولُ اللہ (ﷺ) نے فرمایا' کہ جو شخص اپنے دین (اسلام) کو تبدیل کر دے اسے قتل کر دو“۔

ابو داوٗد میں حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ کسی ایسے مسلمان کا خون جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں' حلال نہیں ہے' مگر تین صورتوں میں۔ ایک تو شادی شدہ زانی' دوسرے قصاص میں اور تیسرے اس شخص کو جو اپنے دین (اسلام) کو ترک کرے اور (مسلمانوں) کی جماعت کو چھوڑ دے۔ مختصر یہ کہ اسلاف و اخلاف کے تمام علماء مرتد کی سزا کے قائل ہیں۔ اکثر اس کے قتل کی طرف گئے ہیں اور یہ ایک طرح سے اجماع کے درجے کو پہنچا ہوا مسئلہ ہے۔ تاہم ائمہِ فقہ میں اس سے متعلق بعض اختلافات بھی ہیں۔

ائمہ کے نزدیک مرتد کے قتل میں عورت اور مرد کی کوئی تفریق و تخصیص نہیں ہے لیکن حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ مرتد عورت کو قتل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اسے قید رکھ کر دوبارہ قبولِ اسلام پر مجبور کیا جائے۔ اور اگر وہ تائب نہ ہو تو اس کو موت تک قید ہی میں رکھا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ اس باب میں یہ دلیل لائے ہیں کہ ”حضور پاک (ﷺ) نے حالتِ جنگ میں بھی کافرہ عورتوں کے قتل سے منع فرمایا ہے تو ارتداد میں بدرجۂ اولیٰ ان کا قتل ممنوع ہو گا“۔

امام مالکؒ اور زیدی شیعہ بھی مرتد کو توبہ کی دعوت دینا اور ان پر اسلام پیش کرنا واجب سمجھتے ہیں۔ اگر وہ تائب نہیں ہوتا تو امام مالک فرماتے ہیں کہ مرتد کو تین دن اور تین رات کی مہلت دی جائے اور اسے توبہ کرنے کو کہا جائے۔ لیکن اگر وہ توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ جبکہ امام اعظمؒ کے نزدیک اسلام پیش کرنا اور توبہ کرانا مستحب ہے' واجب نہیں' کیونکہ مرتد کو تو پہلے ہی اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ مہلت کی مدت کا تعیّن حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر اسے امید ہو کہ دو تین دنوں تک مہلت دے دینے سے وہ اسلام کی طرف لوٹ سکتا ہے تو اسے مہلت دے دے' اور اگر وہ مرتد کے دوبارہ اسلام قبول کرنے سے ناامید ہو چکا ہو تو اسے بروقت قتل کرا دینے کا مجاز ہے۔ مگر امام صاحب اس بات کے حامی ہیں کہ جو شخص ایک بار پہلے بھی مرتد ہو چکا تھا اور اب پھر دائرۂ اسلام سے نکل گیا ہے تو اسے سخت ترین سزا ملنی چاہیئے“۔

رجوع عن الاسلام (ارتداد) تین طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

○ اعتقاداً“

دینِ اسلام کے بنیادی عقائد و نظریات سے منافی یا ان سے متصادم عقائد اختیار کرنے سے بھی آدمی مرتد ہو جاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود ماننا۔ کسی کو رسول اللہ (ﷺ) کے برابر یا آپ سے افضل جاننا۔ عالم کے قدیم ہونے اور خالق و مخلوق کے اتحاد کا عقیدہ رکھنا' نبیٔ آخر الزماں (ﷺ) کے بعد کسی بھی معنیٰ میں کسی کو رسول یا نبی سمجھنا' یا قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار' وغیرہ! وغیرہ!!

یہ تمام عقائد کفریہ اور وجہِ ارتداد ہیں۔ تاہم ارتداد اعتقادی میں یہ بات ملحوظ خاطر رکھی جاتی ہے کہ اعتقادات کا عمل اور قول سے بھی ظہور ہو۔ کیونکہ دل و دماغ

میں کسی قسم کے وسوسوں کا پیدا ہو جانا قابلِ مواخذہ و محاسبہ نہیں ہے۔

○ عملاً"

اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو شریعت میں صریحاً" حرام قرار دے دیا گیا ہوا ہے۔ مثلاً کسی حرام کام کا اعلانیہ ارتکاب۔ مظاہرِ فطرت میں سے کسی کو سجدہ۔ قرآن و حدیث کی توہین۔ جان بوجھ کر فخریہ اور اعلانیہ حرام کاری۔ لواطت کو جائز سمجھنا۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ سے انکار۔ عمداً" قبلہ کی سمت چھوڑ کر کسی دوسری سمت رخ کر کے نماز پڑھنا۔ آقائے نامدار (ﷺ) کی سنت کو سنت سمجھ کر حقارت و اہانت کرنا، وغیرہم۔

یہ بھی ایک مرتد کے اعمال ہیں۔ اس بارے میں علماء و فقہا فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح کے امور کا صدور کسی نو مسلم سے ہو یا ایسے علاقہ کے باشندے سے ہو جہاں جہالت کا دور دورہ ہو اور غالب گمان ہو کہ شخصِ مذکورہ حقیقتِ حال سے بے خبر ہو گا تو اس کی فوراً" تکفیر نہیں کی جائے گی بلکہ شرعی دلائل کے ذریعے اسے مائل اور قائل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ باوجود اس کے اگر وہ اثر قبول نہیں کرتا، یا ایسے اعمال کسی نسلی مسلمان سے صادر ہوں، یا پھر وہ ایسی جگہ کا مکین ہو جہاں علم کا چرچا ہو تو تکفیر کا اعلان کر دیا جائے گا اور مرتد کی سزا کے اجراء کے لئے تمام شرعی تقاضے ادا کیئے جائیں گے۔

قولاً"

کلمۂ کفر پر اصرار و تکرار، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے انکار، اسلام سے براءت کا اظہار، نبیٔ آخر الزماں (ﷺ) کے بعد کسی بھی انداز میں کسی کی نبوت و رسالت کا اقرار، حشر و نشر کے معاملات سے فرار یا اسی نوع کی کسی تہمت کا اقرار، حشر و نشر کے معاملات سے فرار یا اسی نوع کی کوئی تہمت و گفتار سے بھی کفر و ارتداد لازم

آتا ہے۔

ایسی صورت میں تکفیر سے قبل علماء کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ پوری تحقیق کر لیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کفر کا ارادہ نہ کرے اور کلمۂ کفر زبان سے نکال دے۔ بحر الرائق میں ہے: "اگر کسی مسئلے میں ایسی بہت سی وجہیں ہوں جن سے کفر کو لازم آتا ہے اور ایک وجہ بھی ایسی مل جائے جو تکفیر کے خلاف ہو تو مفتی کو چاہیئے کہ تکفیر نہ کرے، کیونکہ مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا چاہیئے"۔

البتہ اگر مفتی یہ محسوس کرے کہ کلمۂ کفر کہنے والے نے مذاق اڑانے کے لئے کہا ہے اور عمداً" کفریہ بات زبان سے ادا کی ہے، تو پھر تکفیر کر دے۔ اگر جبراً" کسی سے کلمہ کفر ادا کرایا جائے تو وہ کافر و مرتد نہیں ہو گا۔ اگر بے ہوشی کے عالم میں کلمۂ کفر زبان سے نکالے تو کافر نہ ہو گا اور یہ کہ نشے کی حالت میں بھی کفریہ کلمات صادر ہو جانے سے ارتداد لازم نہیں آتا۔

مرقومہ بالا مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مرتدین جتھہ کی صورت میں ہوں، صف بندی کر رہے ہوں۔ ریاستی ادارے کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں، یا ان سے بغاوت کے آثار نمودار ہوں تو انہیں تہِ تیغ کر دیا جائے گا اور اسلام کی طرف لوٹ آنے والوں کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اگر مرتدین منتشر ہوں اور ارتداد ان کا انفرادی فعل ہو نہ کہ اجتماعی، تو ان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ توبہ کے لئے کہا جاتا رہے گا۔ ان پر دوبارہ اسلام پیش کریں اور بعض امکانی صورتوں میں حاکم کو یہ حق ہے کہ ان کا اعتذار قبول کرے، یا تلوار سے دوچار کر دے۔ اس منظر نامہ میں مولانا وحید الدین خان کی یہ رائے ملاحظہ فرمایئے: "چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے محقق علماء موجود رہے ہیں جنھوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ سفیان الثوری (۹۷-۱۶۱ھ) کو

سید اہل زمانہ فی علوم الدین کہا جاتا ہے۔ مرتد کے بارے میں ان کا قول ہے کہ "(یستتاب ابداً" ولا یقتل) اس سے ہمیشہ توبہ کے لئے کہا جائے گا' اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی حکم شاتم کا بھی ہے' کیوں کہ شاتم کا حکم حدیثِ ارتداد ہی سے اخذ کیا جاتا ہے"۔

مولانا موصوف نے ابنِ تیمیہ پر بڑی لے دے کی اور ان پر "دھاندلی" کا الزام عائد کیا ہے۔ حالانکہ تضادِ فکری اور دھاندلی کی حقیقی علامات خود ان میں پائی جاتی ہیں۔ مندرجہ بالا پیرے کا آخری جملہ ایک بار پھر پڑھیے۔ یہ جملہ مذکور کی ذاتی رائے پر مشتمل ہے مگر انہوں نے اسے یوں سجا دیا ہے کہ جیسے یہ حضرت سفیان ثوریؒ کی زبان ہی سے ادا ہوا تھا۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ آغازِ اسلام سے ہی شتم کو ارتداد سے ایک علیحدہ جرم سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاریخِ اسلام میں آج تک کسی ایک فرد نے بھی شاتم کو صرف اس لئے گردن زدنی قرار نہیں دیا کہ وہ مرتد متصوّر ہوا' بلکہ اس کے برخلاف ارتداد کی شکل میں قتل کی سزا کا ایک سبب شتم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ارتداد والی حدیث سے دلیل پکڑیں تو پھر صرف گستاخیٔ رسول (ﷺ) کی وجہ سے مرتد ہو جانے والوں کی گردنیں ماری جاتیں اور کسی غیر مسلم بدزبان و گستاخ کو اس جسارت سے متعلق کبھی سزا نہ دیتے' جبکہ یہاں شواہد اس کے بالکل برعکس ہیں۔

یہ اشتباہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ سے ایک قول یادگار ہے جس میں انہوں نے شاتم کو مرتد گردانا اور کہا ہے کہ اس سے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر وہ توبہ کرے تو خیر ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ حالانکہ احناف کی کتابوں میں امام صاحب ہی کا یہ مستند و معتبر قول بھی درج ہے کہ اسے ضرور قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ الغرض یہ کہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ اس کے

لازمی قتل کے قائل ہیں۔ اور اگر وہ توبہ بھی کرے تو قبول نہیں کی جائے گی۔ مزید برآں یہ کہ تمام ائمہ فقہ ایک ملحد و زندیق تک کی توبہ و معافی کو تسلیم کر لینے کا حکم دیتے ہیں مگر گستاخِ رسول (ﷺ) کے بارے میں فرماتے ہیں اگر کوئی صدقِ دل سے توبہ کرے گا تو اسے شاید اُخروی دنیا میں رعایت حاصل ہو سکے مگر ہم اسے معاف کر دینے کا قطعاً" کوئی حق نہیں رکھتے۔ لطف یہ کہ ارتداد میں نیت دیکھی جاتی ہے۔ اور یہ کہ عقائد کا عمل اور قول سے بھی اظہار ہو۔ لیکن شانِ رسالت مآب (ﷺ) میں ادنیٰ سی گستاخی اور وہ الفاظ جو موہمِ تحقیر ہوں ان کا استعمال بھی' مجرم ٹھہرا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس میں اچھی بُری نیت کا بھی کوئی دخل نہیں۔ جبھی تو خداوندِ قدّوس نے ان الفاظ میں خطاب فرمایا تھا کہ اے ایمان والو! میرے محبوب (ﷺ) کی خدمت ناز میں رَاعِنَا کا استعمال نہ کیا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال غارت ہو جائیں اور تمہیں معلوم تک بھی نہ ہو۔ کیا اصحابِ اجمعین (رضوان اللہ تعالیٰ) کی نیتوں پر شک کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان نفوسِ قدسیہ کے فکر و عقیدہ میں کوئی کجی تھی؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ لہٰذا اس باب میں کسی کا کوئی عذر قابل قبول ہے اور نہ کوئی بہانہ کارگر ہو سکتا ہے۔

"ابنِ تیمیہ کی کتاب"

امام ابنِ تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) تاریخ اسلام کی ایک مشہور شخصیت ہیں۔ ان کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ ان کی یادداشت کو عجوبۂ روزگار تسلیم کیا گیا۔ مخالفین نے بھی ان کے ذہن کو ایک زندہ قاموس کہا ہے۔ امام ذہبی ان کے بارے میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ کوئی حدیث جس کو ابنِ تیمیہ نہ جانتے ہوں' وہ حدیث ہی نہیں' حافظے کی

اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابیں معلومات کا خزانہ ہوتی ہیں۔ اس اقرار کے بعد ایک معترض لکھتا ہے کہ "ان کی کتابیں معلومات کے اعتبار سے جس معیار کی ہوتی ہیں، وہ تجزیہ اور استدلال کے اعتبار سے اسی اعلیٰ معیار کی نہیں ہوتیں۔ اس کا ایک نمونہ ابنِ تیمیہ کی موجودہ کتاب (الصّارم المسلول علیٰ شاتم الرسولؐ) بھی ہے۔ بلاشبہ زیرِ بحث موضوع پر معلومات کے اعتبار سے ان کی یہ کتاب منفرد کہی جا سکتی ہے۔ مگر تجزیہ اور استدلال کے اعتبار سے وہ کوئی معیاری کتاب نہیں۔"

امام ابنِ تیمیہ کی یہ نمائندہ کتاب، مجلس دائرۃ المعارف (حیدر آباد) سے ۱۳۲۲ھ میں بھی چھپی تھی۔ اس کے چھے صد (۶۰۰) صفحات ہیں۔ معترض ہی کے بقول "اس کتاب میں شتمِ رسولؐ کے مسئلہ پر نہایت تفصیلی بحث ہے۔ اس موضوع پر اسلامی کتب خانہ کی غالباً" یہ سب سے جامع کتاب ہے"۔

اس کتاب کی تصنیف کا سبب یہ تھا کہ ان کے عہد میں یہ خبر عام ہوئی کہ عساف نصرانی نے پیغمبرِ اعظم (ﷺ) پر سبّ و شتم کیا۔ پھر اس کی سزا اور عوام کے غیظ و غضب سے بچنے کے لئے ایک بدوی کے ہاں پناہ گزیں ہو گیا، جس نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ اس پر ابنِ تیمیہ، شیخ الحدیث زین الدین عبداللہ بن مروان الفاروقی کے ہمراہ دمشق کے نائب السلطنت کے پاس پہنچے اور اس سے حقیقتِ حال بیان کی۔ اس نے یہ ماجرا سن کر گستاخ نصرانی کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وہ حاضر کیا گیا۔ اس کے ہمراہ وہ بدوی بھی تھا، جس نے اسے اپنی حفاظت مین لے کر لوگوں سے بچا رکھا تھا۔ لوگ اس جسارت پر سخت مشتعل تھے۔ لہٰذا انہوں نے دیکھتے ہی نصرانی اور بدوی پر سنگ باری شروع کر دی۔ حاکمِ دمشق نے ابنِ تیمیہ اور ان کے شیخ الحدیث کو اس الزام میں دھر لیا کہ انہوں نے لوگوں کو بھڑکا کر انتظامِ حکومت درہم برہم کیا۔ نیز دوسری طرف نصرانی کو براءت کا موقع فراہم کیا گیا۔ جس نے اس دوران اسلام قبول

کر لیا اور یوں معافی کا حق دار ٹھہر گیا۔

اس واقعہ اور اس کے مضرات و مضمرات سے متأثر ہو کر ابنِ تیمیہ نے تحریکِ شماتت اور مسلم حکّام کی نرم روی و رواداری کے خلاف قلمی جہاد شروع کیا۔ نتیجتاً" یہ قابلِ ذکر کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ سرکارِ ہر عالم (ﷺ) کا گستاخ واجب القتل ہے اور اس کی توبہ قابلِ قبول نہیں۔ اس کتاب کے مطابق، ابنِ تیمیہ کا نظریہ یہ ہے کہ شتمِ رسول ﷺ کی سزا لازمی طور پر قتل ہے۔

ابنِ تیمیہ نے اپنی کتاب میں کئی ایک قرآنی آیات سے استنباط کیا اور زمانۂ رسالت (ﷺ) کے کچھ واقعات بھی جمع کیے ہیں۔ انہوں نے آقائے مدنی (ﷺ) کی حرمت و شان میں گستاخی کے مرتکب کے بارے میں جمہور علما و فقہا کے مسلک کو دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس پر علماءِ اسلام کا اجماع ہے۔ وہ ارتداد اور اس کی سزا کو بھی بطور دلیل لائے ہیں۔ چونکہ دینِ اسلام میں مرتد کی سزا، قتل ہے، لہٰذا ابنِ تیمیہ اسے بھی سخت ترین ارتداد گردانتے اور اس پر حد کے نفاذ کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔

دنیائے اسلام میں شتمِ رسولؐ کی سزا پر یہ کتاب کافی مشہور ہے۔ لیکن اپنے موضوع پر واحد کتاب نہیں ہے۔ الشفاء (بتعریفِ حقوق المصطفیٰؐ) بھی اس بارے میں ایک اہم مآخذ ہے۔ ابو الفضل قاضی عیاضؒ (انہیں ابنِ تیمیہ پر اولیت و فوقیت بھی حاصل ہے) اس میں موضوع سے متعلق ایک عظیم سرمایہ جمع فرما گئے ہیں۔ میرے سامنے انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں کا اپریل ۱۹۸۳ میں چھپا ہوا نسخہ موجود ہے۔ مترجم و محشّی، سید محمد متین ہاشمی ہیں۔ جلد دوُم کے پورے ساڑھے پانچ صد (۵۵۰) صفحات اسی موضوع پر ہیں۔ علاوہ ان کے، جدید و قدیم جمیع تفاسیر اور

رسائلِ فقہ میں اس کی تائید و توضیح موجود ہے۔ دنیائے اسلام کے علماء و فقہا اس رائے پر ہیں کہ شاتمِ رسول (ﷺ) کی سزا قتل ہے۔ ابنِ قیم نے لکھا ہے کہ شتمِ رسولؐ کا مسئلہ حرمتِ رسول ﷺ کا مسئلہ ہے۔ للذا یہ حقوق العباد کے تحت آتا ہے۔ مختصر یہ کہ تمام مفسرین و محدثین اور علماء و فقہا نے اسے دین و ایمان کا اساسی مسئلہ قرار دیا ہے۔

ابنِ تیمیہ کی کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم ہونے کے باوجود کوئی حجت ہرگز نہیں ہے، اور رسولِ پاک (ﷺ) کے سوا کسی دوسرے کے لیئے یہ مقام و مرتبہ مختص بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ابنِ تیمیہ کی کتاب میں کوئی واقعاتی غلطی، فکری لغزش استدلالی کمزوری یا کسی دوسری نوع کا کوئی جھول بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات اہم نہیں کہ ابنِ تیمیہ نے کہا، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے کیا کہا۔ بالفرض امام ابنِ تیمیہ اِس نظریہ کے مخالفین میں ہوتے (جیسا کہ بعد میں ہُوا) تو بھی کچھ فرق نہ پڑتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں خود ابنِ تیمیہ سے شانِ رسالت میں بے احتیاطیاں سرزد ہوئیں۔ ۷۲۶ھ میں اس امر کی شہادتیں سامنے آئیں کہ ابنِ تیمیہ، گنبدِ خضرا کی زیارت کی نیّت سے اختیار کیئے گئے سفر کو شرک کہنے لگے ہیں۔ اس پر حکومتِ وقت نے انھیں پابندِ سلاسل کر کے قلعہ میں قید کر دیا۔ یہاں تک کہ بائیس ذی قعد کی رات ۷۲۸ھ کو قید ہی میں موت نے آ لیا۔ ابنِ تیمیہ کے ایک سوانح نگار اس واقعہ کے باب میں لکھتے ہیں: "جب یہ ساری روداد مصر پہنچی تو مصر کے اٹھارہ فقیہوں نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا، ان سب کے سرکردہ قاضی تقی الدین محمد بن ابی بکر اخنائی مالکی تھے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل تھی کہ انبیا اور خاص کر نبی کریم (ﷺ) کی قبر کی زیارت کے سفر سے روکنا درحقیقت آنحضرت

(ﷺ) کی تنقیص ہے جو صریح طور پر کفر ہے اور کفر کی سزا قتل ہے"۔

اس سلسلے کی بعض مزید کڑیاں مندرجہ ذیل ہیں:

- سلطان ناصر نے حکم بھیجا کہ امام موصوف کو دمشق کے قلعہ میں نظر بند کر دیا جائے۔
- شعبان ۷۲۶ھ کو پیر کے دن عصر کی نماز کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔
- این میری شمل لکھتی ہیں کہ ابنِ تیمیہ کو دمشق میں رسولِ پاک (ﷺ) کے نعلینِ پاک کے نقش کی توہین کرنے کی وجہ سے غیر معمولی سزا سنائی گئی تھی۔

حیران کن بات یہ ہے کہ آخر الذکر واقعہ ابنِ تیمیہ کے کسی بھی دوسرے سوانح نگار نے نہیں لکھا۔ تاہم اس حقیقت کو قریباً" سبھی نے تسلیم کیا ہے کہ ان کی زندگی کا اختتام جیل میں ہوا تھا اور یہ کہ قید کر دیئے جانے کا حقیقی سبب، سرورِ انبیا (ﷺ) کے آثار و مزار کے بارے میں توہین آمیز رویّہ تھا۔

واقعاتی معجزات

عہدِ حاضر میں مخالفین و معترفین کی طرف سے کئی ایک سوالات اٹھائے گئے اور اعتراضات وارد ہوئے۔ عموماً" ان کے ہر سوال کا انداز غیر علمی اور اعتراض برائے اعتراض کا رنگ لیئے ہوئے ہے۔ یہ مغرب گزیدہ دانشور، قرآنی احکامات کو اپنے ذوق کی بھینٹ چڑھاتے اور عہدِ رسالت مآب (ﷺ) میں پیش آنے والے چند مخصوص واقعات کی تعبیر میں کئی گُل کھلاتے ہیں۔ گستاخوں کے انجام سے متعلق ناقابلِ تردید نظائر کو نظرانداز کر کے ان کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ سید العرب والعجم (ﷺ) نے ایسے کئی مواقع پر مجرموں کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ فرمایا۔

آپ ﷺ کا رویّہ و سلوک معاف فرمادینے والا ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا ہمیں بھی شاتمانِ رسول (ﷺ) کے لیئے ہلاکت کی سزا تجویز کرنے کا کوئی حق یا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ تحریر میں لایا جاچکا ہے۔ محبوبِ خدا ﷺ کی حیاتِ مقدسہ اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اسے ایک اور عنوان سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ گالی اور ایذا میں فرق ہے۔ اس رعایت سے چند مشائخ کا یہ خیال بھی ہے کہ وہ جو مالِ غنیمت تقسیم کرنے کے وقت ایک شخص نے حضور سرورِ کونین (ﷺ) سے کہا تھا کہ یہ وہ تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ آپ ﷺ کو انصاف کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اسے نبئ کریم رؤف الرحیم (ﷺ) نے اپنے اوپر تہمت اور طعن کے بجائے اس شخص سے رائے قائم کرنے میں غلطی ہو جانے پر محمول فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے قول کو گالی نہیں سمجھا بلکہ یہ خیال فرمایا کہ یہ ایک قسم کی ایذا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے اپنے اخلاقِ حسنہ کے مطابق صبر کیا اور معاف فرما دیا۔ تاہم قاضی عیاض کے نزدیک جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ نبئ برحق ﷺ کے حق میں گالی اور ایذا دونوں کی حیثیت برابر ہے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کو سخت جانی و مالی ایذائیں پہنچائی گئیں، جادو کیا گیا اور زہر دیا گیا۔ مگر آپ ﷺ نے حکم و حکمت کے تحت صبر کیا، حالانکہ یہ اقدامات بظاہر گالی دینے سے زیادہ سخت نظر آتے ہیں۔ مگر ایک وقت آیا کہ جب آپ ﷺ نے شریر، بے ایمان اور بد زبان لوگوں کو قرارِ واقعی سزا دی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر نقضِ عہد کے مرتکب افراد و قبائل کا تلوار سے فیصلہ فرمایا۔

کتبِ احادیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ایک قول منقول ہے

کہ حضورِ پاک (ﷺ) نے کبھی اپنے نفس کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ البتہ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی ہتک کی تو پھر اس کے لیئے انتقام لیا۔ اگر ایمان کی آنکھ سے دیکھا جائے تو اس قول سے فہم و ادراک کے کئی چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ صاحب الشفاء کے بقول، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ نے اس سے انتقام نہیں لیا جس نے آپ ﷺ کو گالی دی یا ایذا پہنچائی یا آپ ﷺ کو جھٹلایا، کیونکہ آپ ﷺ کے ساتھ اس قسم کا سلوک تو درحقیقت تو اللہ تعالیٰ کی حرمت و عزت کی ہتک تھی۔ یہ اس لیے کہ آپ کا سارا مقام و مرتبہ، عزت و عظمت اور وقار و شان تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا اس پر آپ ﷺ نے کسی کو جب سزا دی تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ اسے دراصل اللہ تعالیٰ کی ہتک کرنے پر ہی سزا دی گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو ایذا دیتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایذا کس طرح دی جا سکتی ہے؟ اسی حکمت و فلسفہ کو بیان میں لاتے ہوئے امام ابنِ تیمیہ فرماتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول (ﷺ) کی جہت ایک ہے۔ جس نے حضور ﷺ کو ایذا دی، اس نے گویا اللہ کو ایذا دی اور جس نے حضور ﷺ کی اطاعت کی، اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی، کیونکہ امت بلا واسطۂ رسولؐ، اس چیز کو نہیں پہنچ سکتی جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہے۔ سوائے رسول اللہ ﷺ کے، امت کے لیئے کوئی سبیل اور واسطہ نہیں ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (ﷺ) کو اپنا خلیفہ بنایا اور قائم مقام کیا ہے۔ تمام اوامر و نواہی میں اپنی خبر اپنے میں اور بیان میں، اور ان امور میں اللہ اور رسول اللہ (ﷺ) کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں۔ البتہ

اس بارے میں قاضی عیاضؒ نے توضیح فرمائی ہے کہ اگر کسی نے آپ ﷺ کے ساتھ بے ادبی کی، یا قولاً" فعلاً" بدمعاملگی کی، خواہ جان کے معاملے میں ہو یا مال کے معاملے میں ہو اور ایسا کرنے والے کا مقصود در حقیقت آپ ﷺ کو ایذا پہنچانا نہ تھا۔ بلکہ اس نے اس طرح کے اقدامات اپنی جبلّی یا فطری اُفتاد کی بنا پر کیے۔ مثلاً بدّوؤں کی آپ ﷺ سے اپنی جہالت یا فطری اجڈپن کی وجہ سے بدسلوکی یا ایسا عمل جو بشری فطرت کے تحت ہوا تو آپ نے اس کا انتقام نہیں لیا اور معاف فرما دیا۔

مثلاً ایک بدّوُ نے آپ ﷺ کی چادر پکڑ کر گھسیٹ لی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کی گردن پر داغ ہو گیا۔ یا ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا اور اس نے انکار کر دیا۔ اور حضرت خُزیمہؓ نے گواہی دی (کہ آپ ﷺ نے اس اعرابی سے گھوڑا خریدا) اور جب آپ ﷺ نے حضرت خزیمہؓ سے دریافت فرمایا کہ تم کیسے گواہی دیتے ہو؟ اس لیے کہ تم تو خرید و فروخت کے وقت موجود نہ تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ ﷺ چونکہ اللہ کے سچے رسول ہیں، اس لیے میں آپ ﷺ کی تصدیق کرتا ہوں۔ حضرت خزیمہؓ کے اس عمل سے آپ ﷺ اتنے خوش ہوئے کہ آپ نے ان کی ایک گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دے دیا۔ الغرض یہ کہ آپ ﷺ کی ظاہری حیاتِ مبارکہ میں کفار میں سے کسی کا آپ ﷺ کو جسمانی تکلیف پہنچانا اور دشمنی اختیار کیے رکھنا، ایک اور بات تھی۔ اس پر آپ ﷺ کا کسی کو معاف کر دینا علیحدہ مفہوم رکھتا ہے۔ آپ ﷺ کو اس کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو اس کا مکمل اختیار حاصل تھا۔ لیکن امت میں سے یہ حق و اختیار کسی کو کسی طرح بھی منتقل نہیں ہوا ہے اور نہ ہی کسی طرح ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے حق اور اختیار کی بنا پر اس یہودی کو بھی معاف فرما دیا تھا۔ جس نے آپ

ﷺ پر جادو کرنے کی کوشش کی اور اس اعرابی سے بھی بازپُرس نہ فرمائی جس نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ و اقدام کیا۔ حالانکہ اسلام میں اقدامِ قتل اور جادو کے علاوہ بعض دیگر جرائم کے ارتکاب پر بھی باقاعدہ سزا مقرر ہے۔

تحفّظِ عزّت کے متعلق حضرت عمرؓ کے دور میں قتل کے دو واقعات ہوئے۔ لیکن انھوں نے دونوں میں قصاص کو ساقط کر دیا اور قاتل کو کوئی سزا نہیں دی۔ ایک واقعہ میں بنی ہذیل کے کسی شخص نے اپنے میزبان کی بیٹی سے دست درازی کی، اس نے پتھر کھینچ مارا، جس سے اس کا جگر پھٹ گیا۔ آپ نے فیصلہ دیا، یہ قتیل ایسی ہے کہ اس کی دِیَت نہیں ہو سکتی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ دو نوجوان ایک دوسرے کے بھائی بنے۔ ایک جہاد پر چلا گیا اور دوسرے کو اپنے گھر کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا۔ اس نے ایک رات کسی یہودی کو اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تو اسے قتل کر کے عریاں لاش راستے پر ڈال دی۔ صبح یہودیوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا تو انھوں نے نوجوان کا بیان سن کر کہا۔ "اللہ تیرے ہاتھ سلامت رکھے"۔ اور یہودی کے خون کو رائیگاں قرار دے دیا۔

علامہ محمد فرید وجدی نے عام حالات میں سات جرائم قابلِ حد تسلیم کیے ہیں۔ بقول ان کے، نص کے لحاظ سے اسلامی شریعت میں فقط سات جرائم پر سات شرعی حدود مقرر کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر جرائم قاضی کی مرضی پر منحصر ہیں۔ اور وہ سات حدود یہ ہیں ○ حدِ ارتداد ○ حدِ بغاوت ○ حدِ زنا ○ حدِ قذف ○ حدِ سرقہ ○ حدِ رہزنی ○ حدِ شراب خوری ○ حدِ قصاص کو علیحدہ بیان میں لایا گیا ہے۔

بنا بریں مساحقہ، لواطت، جادو، جاسوسی، غداری، اور مویشیوں وغیرہ سے حرام کاری کے لیئے بھی سخت سزائیں مقرر ہیں اور ان کے علاوہ بعض دیگر جرائم پر نرم و گرم سزاؤں کا تعیّن مصلحتاً" و حکمتاً" قاضی کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ

عصری تقاضوں اور ماحول کی نزاکت و موافقت کے مطابق ان کا اجراء ہو اور مؤثر و مفید رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی حدود و تعزیراتِ شرعیہ سے متعلق اپنی مشہور کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں۔

"بعض معاصی کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کی ہے۔ یہ وہی معاصی ہیں، جن کے ارتکاب میں زمین پر فساد پھیلتا، نظامِ تمدّن میں خلل پیدا ہوتا اور مسلم معاشرے کی طمانیت اور سکونِ قلب رخصت ہو جاتا ہے۔"

دوسری بات یہ ہے کہ وہ معاصی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دو چار بار ان کا ارتکاب کرنے سے ان کی لت پڑ جاتی ہے اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے معاصی میں محض آخرت کے عذاب کا خوف دلانا، اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرتناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب ساری زندگی معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے۔ اور سوسائٹی کے دیگر افراد کیلیے سامان عبرت بنے، اور اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرم کرنے کی جرأت کریں۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فتنہ، قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی کے تحت حضرت شاہ ولی اللہ نے حدودِ دینیہ کے مندرجہ بالا فلسفے کو جامہ الفاظ پہنایا ہے۔ دنیا میں سب سے بڑا فتنہ، اور معاشرے کے امن و سکون کو تباہ و برباد کرنے والا کوئی عمل، اللہ کے کسی پیغمبر پر بہتان باندھنے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ سرکارِ مدینہ ﷺ تمام انبیاء کے سردار اور محبوب کردگار ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کی شان میں کوئی ناقص یا کج اشارہ، کنایہ یا بیان، ایک ناقابلِ عفو گناہ اور کائنات کا سب سے بڑا جرم ہے۔ تقاضائے انصاف یہ ہے کہ جتنا گھناؤنا جرم ہو، اسی قدر سخت ترین

سزا تجویز کی جائے۔ خداوند کریم نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے گستاخوں کو عبرت و ذلت کا نشان بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ آمنہ کے لال (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے بھی اس کا اہتمام و انصرام فرمایا۔ صحابۂ کرامؓ اپنے آقا و مولاؐ کی اس سنت جلیلہ و عظیمہ پر باقاعدگی سے عمل پیرا رہے۔ دنیائے اسلام کے تمام فقہاءِ عظام اور علماءِ کرام اس مسئلے میں متفق الرائے اور متحد البیان ہیں۔ اس بارے میں اجماعِ امت کی شان کچھ یوں ہے۔ کہ اس کے خلاف پوری تاریخِ اسلامیہ میں ہمیں ایک بھی حوالہ میسر نہیں آتا۔

عجیب یہ ہے کہ اس کے باوجود دورِ حاضر میں بعض لوگ نہ صرف یہ کہ اس سے انکار کرتے ہیں بلکہ عجیب تر یہ ہے کہ وہ خود کو مسلمان بھی کہلواتے ہیں۔

اف! اسلام کا المیہ کہ زوال کی داستان اب یہاں تک آ پہنچی ہے۔

ایک مخالف و معترض نے شاتمانِ رسول (ﷺ) کی سزائے قتل کے قائلین کے بارے میں طنزاً لکھا ہے کہ یہ استدلال کی وہی قسم ہے جس کے ذریعہ شاعر نے شہد کی مکھی کے "قتل" کا جواز نکالا تھا۔ "مگس کو باغ میں جانے نہ دینا، کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا" مگر امرِ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے دلائل و براہین کیلیے جو معیار پیش کیا، اسے نرم ترین الفاظ میں ان کا فکری انتشار اور نظری خلفشار ہی کہہ سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"ابنِ تیمیہ اور دوسرے لوگ (مثلاً ابن قیمؒ) نے لکھا ہے کہ شتمِ رسول (ﷺ) کا مسئلہ حرمتِ رسول ﷺ کا مسئلہ ہے۔ اس طرح وہ سب و شتم کے معاملہ کو حرمتِ رسولؐ کا معاملہ قرار دے کر اس کو حقوق العباد کے تحت لائے ہیں۔ مگر یہ ان حضرات کی محض ذاتی توجیہ ہے۔ اور جب تک قرآن و حدیث کی واضح دلیل نہ ہو، اس کو حقوق العباد، بالفاظِ دیگر، ذاتی حق کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) پر حملہ سادہ معنوں میں ان کی ذات پر حملہ نہیں، براہِ راست اسلام پر حملہ ہے۔ اس طرح وہ ذاتی حق کے بجائے دینی دفاع کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص اگر کہے کہ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) عادل نہیں تھے تو یہ آپ ﷺ کے اوپر محض ایک شخصی حملہ نہیں ہوا۔ ایسا حملہ پورے قرآن اور پورے عالمِ اسلام کو مشتبہ قرار دینے کے ہم معنیٰ ہے۔ شاتم دراصل اپنی شتم کے ذریعہ اسلام کی صداقت پر ایک قسم کا فکری حملہ کرتا ہے۔ اور جو حملہ فکری نوعیت رکھتا ہو، اس کا توڑ جوابی فکری یلغار ہی کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ تلوار کے ذریعہ شاتم کی گردن کاٹ دینے سے اس کا دفعیہ نہیں ہوتا۔"

یہ صاحب آگے چل کر مزید تحریر لکھتے ہیں۔

"فکری اور نظریاتی فتنہ کو اس طرح ختم نہیں کیا جاسکتا کہ بندوق ہاتھ میں لی جائے اور متعلقہ شخص کو گولی مار کر اس کا خاتمہ کردیا جائے۔ قاتل کو قتل کرکے قتل کا ازالہ ہو جاتا ہے مگر شاتم کے قتل سے شتم کے ازالہ نہیں ہوتا۔ شتم ایک ایسا مسئلہ ہے جو شاتم کے قتل کے بعد بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ اور جب اصل مسئلہ بدستور باقی رہے۔ تو ایک شخص کو قتل کردینے سے کیا حاصل؟"

معترض مذکور نے جن عقلی دلائل کو اپنے مؤقف کی تائید میں استعمال کرنا چاہا، لطف ہے کہ وُہی ان کی تردید و مخالفت میں جاتے ہیں۔ روحِ اسلام یہ ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن (ﷺ) کو جداگانہ حیثیتوں میں نہیں دیکھا جاسکتا۔

پیغمبرِ حسن و جمال (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات ہی اسلام اور قرآن کی صداقت و حقانیت کی سب سے عظیم و معتبر دلیل ہے۔

شاتم اپنی شتم کے ذریعے اسلام کی صداقت پر فکری نوعیت کا حملہ نہیں کرتا بلکہ یہ آپ ﷺ کی ذات و صفات پر حملہ کرتا ہے۔ جو کہ لازمی طور پر "حقوق

العباد" کے زُمرے میں آئے گا۔ مادیت گزیدہ اشخاص نے اکثر اس نازک مسئلہ کو سمجھنے میں شدید ٹھوکر کھائی ہے۔ اور اس کا اہم سبب وجدان و عرفان کا فقدان ہے۔ دو صورتوں میں اس کا دفاع ممکن ہے۔ ایک علمی و فکری محاذ پر، جبکہ دوسرا قانون و سزا کی صورت میں۔ اسلام یا پیغمبرِ اسلام (ﷺ) پر اعتراض، تاریخی و تحقیقی نوعیت کا ہو تو اول الذکر ضابطہ اور اگر اعتراض، غیر علمی، غیر سنجیدہ، غیر مہذب اور ذاتی و صفاتی طرز کا ہو تو ثانی الذکر طریقہ بروئے کار لانا ناگزیر ہے۔ بھلا گالی گلوچ کا بھی علمی انداز میں دفاع ممکن ہے؟ فتنہ باز اور بہتان طراز کے لیے کونسی فکری یلغار اور نظری تلوار کارگر ہے؟

مزید برآں ان کا یہ استدلال بھی یکسر غلط ہے کہ قاتل کو قتل کردینے سے قتل کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک بے گناہ اور معصوم شخص کی ہلاکت کے بدلے میں کسی بدمعاش یا غنڈے کو مار دیا جائے تو بھی حساب برابر نہیں ہوتا۔ سوسائٹی پر اس کا زہریلے اثرات اور بُرے ثمرات ہمیشہ کیلئے باقی جاتے ہیں۔ قاتل کو سزا دینے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ یوں جرم کا ازالہ ہوگیا۔ بلکہ اس سے قدرت کا منشا اور فطرت کا تقاضا یہ ہوا کہ قاتل کو نمونۂ عبرت بنادیں تاکہ آئندہ کیلئے یہ دروازہ بند ہو۔ اگر اس باب میں معترض کی منطق کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر دشمن ملک یا قوم کے لیے جاسوسی کرنے والے شخص کی اصلاح کے لیے کتب و رسائل لکھے اور براہین و دلائل تراشے جانے چاہئیں۔ کہ وہ اپنے ملک و قوم کے خلاف نازک اطلاعات تو بہم پہنچا چکا، اب اسے اسلامی حد کی زد میں لے آنے سے کیا حاصل؟ یہی سبب ہے کہ اسلامی قانون میں عمومی جرائم پر تعزیر لاگو ہوتی ہے۔ جبکہ سنگین اور قبیح جرائم پر بطورِ حد سزا کا نفاذ عمل میں لایا جاتا ہے۔ اصلاحِ احوال مطلوب ٹھہرے تو تعزیر اور اگر بیخ کنی مقصود ہے تو حد۔

اس باب میں آج کل یہ جدید گروہ کعب بن الاشرف کے واقعۂ قتل کے پس منظر کو بھی جھٹلانے اور نئی نئی باتیں بنانے لگا ہے۔ ایک صاحب یہاں تک کہ گئے ہیں کہ کعب بن الاشرف کو بار بار نقضِ عہد (غدّاری) کرنے کی بِنا پر قتل کیا گیا۔ کعب بن الاشرف دوسرے تمام مخالفین کی طرح سبّ و شتم کے الفاظ بولتا تھا۔ مگر اس کے قتل کا سبب اس کا نقضِ عہد تھا' نہ کہ سادہ طور پر صرف سبّ و شتم۔ طُرفہ تماشا یہ کہ وہ اس تاریخی صداقت اور مسلّمہ حقیقت کو جُھٹلاتے ہوئے کوئی حوالہ پیش نہیں کرپاتے۔ دوسرے الفاظ میں ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ نقضِ عہد کے جرم میں حد جاری کی جاسکتی ہے' بشرطیکہ یہ بار بار ہو' لیکن سبّ و شتم کوئی جرم نہیں۔ ان کے خیال میں شاید اہانتِ رسول (ﷺ) سے دینی و ملّی مزاج کو نقصان نہیں پہنچتا لیکن وعدہ خلافی سے اس کی بنیادیں ہل کر رہ جاتی ہوں گی۔

اس سلسلے میں بطورِ مثال ایک واقعہ ضرور قلمبند کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں سرورِ کائنات فخرِ موجودات (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے نورِ بصیرت اور علمِ غیب کا کھلا بیان ہے مگر یار لوگ نے اسے "مستقبل پر نظر" کا نام دے دیا۔ یوں ایک خالص دینی موضوع اور بے مثل و بے مثال علمی فضیلت کو گویا ایک عام پیمانہ سے پرکھنے کی جسارت کی گئی۔ جس صفت و کمال کا تعلق' نورِ نبوت اور جوہرِ رسالت سے ہے' اسے محض دوراندیشی و پیش بینی سے موسوم کردیا کرتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل پیشِ خدمت ہے۔

"قدیم مکہ میں جو ممتاز افراد تھے' ان میں سے ایک شخص کا نام سہیل بن عمْرو تھا۔ آج سہیل بن عمْرو کا شمار صحابہؓ میں ہوتا ہے مگر اس سے پہلے وہ رسولِ اکرم ﷺ کے سخت دشمن تھے۔ وہ بدر کی لڑائی میں مشرکین کی طرف سے شامل ہوئے۔ اس لڑائی میں رسول اللہ (ﷺ) کے مقابلے میں مشرکین کو شکست

ہوئی۔ ان کے ۱۷۰ آدمی گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک سہیل بن عمْرو بھی تھے۔

سہیل بن عمرو کے اندر زبان آوری کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ خطیبِ قریش کہے جاتے تھے۔ اپنی اس صلاحیت کو انھوں نے بھرپور طور پر اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ وہ شعر اور خطابت کے ذریعہ رسولِ اکرم ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے خلاف اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اُکساتے رہتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہو کر مدینہ آئے' اور ان پر مسلمانوں کو پوری طرح قابو حاصل ہو گیا' تو حضرت عمر فاروقؓ نے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے کہا کہ اے خدا کے رسول ﷺ' مجھے اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمْرو کے سامنے کے دانت توڑ دوں۔ اس طرح اس کی زبان باہر نکل پڑے گی۔ اور اس کی آواز خراب ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ اس قابل نہ رہے گا کہ آپ ﷺ کے خلاف خطیب بن کر کھڑا ہو سکے۔

بظاہر یہ ایک جائز بات تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس کا مُثلہ نہیں کروں گا۔ اگر میں اس کا مُثلہ کروں تو اللہ میرا مثلہ کرے گا' اگرچہ میں ایک رسول ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے مزید ایک بات فرمائی۔ یہ بات بظاہر شخصی ہے مگر وہ ایک عالمی انسانی حقیقت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ سہیل بن عمرو ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں تم ان کی مذمت نہ کرسکو۔ (سیرتِ ابن ہشام' الجزء الثانی' صفحہ ۲۹۳) چنانچہ مثلہ یا قتل کے بغیر سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ غیر

معمولی سلوک کیا کہ غزوۂ بدر (۲ھ) کے بعد ان پر قابو پانے کے باوجود انہیں رہا کر دیا گیا۔ مگر اب بھی وہ اپنی اسلامی دشمنی سے باز نہ آئے۔ انھوں نے مکہ کے لوگوں کو دوبارہ اکسایا اور تین ہزار کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اندوہ ناک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ اُحد (۳ھ) کہا جاتا ہے۔

یہی سہیل بن عمرو تھے جنھوں نے معاہدۂ حُدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر لفظِ رسول ﷺ کو کاغذ سے محو کروایا تھا۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کو قریش کی یک طرفہ شرائط پر راضی ہونے کیلئے مجبور کیا تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا اس وقت تک سہیل بن عمرو کفر کی حالت میں تھے۔ مگر اب بھی، ثابت شدہ جرائم کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان کو کوئی سزا نہیں دی۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو ان کے ساتھ حسنِ اخلاق کی ہدایت فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص سہیل بن عمرو سے ملے، وہ اس کی طرف تیز نگاہوں سے نہ دیکھے میری جان کی قسم، بلاشبہ سہیل عقل اور شرف والا آدمی ہے۔ اور سہیل جیسا آدمی اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا"۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی رعایتیں جاری رہی۔ غزوۂ ہوازن کے بعد آپ ﷺ نے ان کو ایک سو اونٹ تالیفِ قلب کے طور پر دیے۔ اس عطیہ کے بعد وہ بالکل ڈھے پڑے اور اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی بن گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں یہ تأثر پھیل گیا کہ وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے اسلام کو خدا کی مدد ملتی تھی۔

چنانچہ عرب قبائل کی اکثریت ارتداد کی طرف مائل ہو گئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات ہوئی تو مکہ کے بیشتر لوگوں نے چاہا کہ اسلام سے پھر جائیں۔ انھوں نے اس کا پورا ارادہ کر لیا۔ مکہ کی فضا اتنی خراب ہوئی کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عامل عتاب بن اُسید روپوش ہو گئے۔

مذکورہ سہیل بن عمرو اس وقت تک اسلامی جماعت کے ایک فرد بن چکے تھے۔ وہ شاندار خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بارعب شخصیت والے آدمی تھے۔ جب انھوں نے مکہ کا یہ حال دیکھا تو وہ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ خطیبانہ صلاحیت استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان ایک پُرزور تقریر کی۔ انھوں نے کہا سن لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ اس نے اسلام کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ جو شخص ہمارے خلاف کچھ کرے گا، ہم تلوار سے اس کی گردن مار دیں گے۔

سہیل بن عمرو کی گرج دار تقریر کو سن کر لوگوں نے رجوع کیا۔ انھوں نے اسلام سے پھرنے کا جو ارادہ کیا تھا، اس سے باز آ گئے۔ اس کے بعد عتاب بن اُسید بھی روپوشی سے نکل آئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہی مطلب تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اس قول کا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں وہ تمھارے نزدیک قابلِ مذمّت نہ ہوں بلکہ قابلِ تعریف ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ سُنّت بتاتی ہے کہ آپ کی نظر حال پر نہیں رکتی تھی آپ آدمی کے حال سے گزر کر اس کے مستقبل کے امکانات کو دیکھتے تھے۔ ایک انسان کا آج اگر باغیانہ ہے، تو اس کو نظر انداز کر کے آپ ﷺ یہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ ہمارا وفادار ہو جائے۔ اور

پھر اس کی وہ خداداد صلاحیتیں جو اس وقت اسلام کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں، وہ اسلام کی تائید میں ہونے لگیں تاریخ بتاتی ہے کہ بیشتر موقعوں پر فی الواقع ایسا ہی ہوا۔

رسولِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتِ مقدسہ میں سفر طائف بطورِ خاص قابل ذکر ہے۔ طائف کے سرداروں میں عبدِ یالیل، مسعود اور حبیب جو کہ سگے بھائی تھے، اس بات میں ان کی گستاخی و بے ادبی کا معاملہ بھی اوراق تاریخ میں محفوظ ہے۔ مختصراً واقعات یوں ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد کے دور میں طائف کے تمام باشندے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ مثلاً ابوعبید مسعود ثقفی انھی اہل طائف کی اولاد تھے۔ وہ اس مسلم فوج کے قائد تھے جس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ایران میں جہاد کیا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی فوج کے مقابلے میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر ایرانی فوجوں کو اس قدر مرعوب ہوا کہ انھوں نے جنگ کا حوصلہ کھو دیا۔

محمد بن قاسم ثقفی ۷۱۱ء (۹۵ھ) میں سندھ کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ وہ ایک انتہائی عادل اور باصلاحیت سردار تھا۔ اس نے صرف دو سال کے عرصہ میں سندھ اور پنجاب میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلام کی اشاعت کی کہ ایک پورا علاقہ اللہ کے دین کے سایہ میں آگیا۔ موجودہ پاکستان حقیقت میں محمد بن قاسم کی دین ہے۔

محمد بن القاسم اتنا لائق اور شریف سردار تھا کہ جب وہ ہندوستان سے واپس ہو کر دمشق گیا، تو فتوح البلدان کے بیان کے مطابق، اہلِ ہند اس کے لیے روئے اور اس کا مجسمہ بنا کر اس کی تعظیم و تقدیس کی اسلام کا یہ قیمتی مجاہد اسی قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کی بدترین گستاخی اور ایذاء رسانی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی اگلی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کی عبادت گزار بنیں گے۔

قبیلہ ثقیف (اہل طائف) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گستاخی اور ایذاء رسانی کا بدترین فعل کیا تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کو سزا دینے کا معاملہ پوری طرح آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ پہاڑوں کا فرشتہ (ملک الجبال) آپ ﷺ کے حکم کے نفاذ کے لیے آچکا تھا۔ مگر آپ ﷺ نے ان کو سزا دینے کی بجائے اس کو پسند فرمایا کہ ان کی نسلوں سے ایسے افراد نکلیں گے جو اسلام کے سپاہی بن کر اسلام کی تاریخ بنائیں۔

حالات بتاتے ہیں کہ فی الواقعہ ایسا ہی پیش آیا۔ اگر آپ ﷺ طائف والوں کی گستاخی کی سزا دینے کے لیے ملک الجبال کو استعمال کرتے تو طائف آج صرف کھنڈروں کی داستان ہوتا، نہ کہ اسلام کے قلعہ کی شاندار تاریخ۔

سرورِ انبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے حسنِ سلوک بھی اسی نوع کا ہے کہ بدترین دشمنِ اسلام (ابوجہل) کا بیٹا ہونے کے باوجود، آپ ﷺ نے اس سے کیسا شاندار رویہ اختیار فرمایا تھا اسی طرح ایک اور بات عموماً ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہے:

ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوعبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر نے مقسم بن ابوالقاسم مولیٰ عبداللہ بن الحرث بن نوفل کی روایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اور تلید بن کلاب اللیثی دونوں نکلے، یہاں تک کہ ہم عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کے پاس پہنچے، وہ اپنا جوتا ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ جب حنین کے دن تمیمی نے آپ ﷺ سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا

ہاں۔ بنو تمیم کا ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا۔ اس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس وقت آپ ﷺ لوگوں کو مالِ غنیمت دے رہے تھے۔ (وہ دیکھتا رہا) یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے محمد ﷺ، میں نے اس کو دیکھ لیا جو آج آپ ﷺ نے کیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے فرمایا ٹھیک ہے، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے عدل کیا ہو۔

عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے بیان کیا کہ یہ سن کر رسولِ اکرم ﷺ غضب ناک ہو گئے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ تیرا برا ہو، اگر میرے پاس عدل نہیں ہو گا تو پھر کس کے پاس عدل ہو گا۔

یہ سن کر حضرت عمر بن الخطّاب نے کہا کہ اے خدا کے رسول ﷺ، کیا میں اسے قتل نہ کردوں آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں، اس کو چھوڑ دو۔ عنقریب اس کی ایک جماعت ہو گی جو دین میں تعمق کرے گی۔ یہاں تک وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے کہ تیر شکار سے"۔

یہ واضح طور پر سیدِ خیرالانام (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے زندہ معجزات کی بے بہا شان کا بیان ہے۔ ان واقعات میں آقائے نامدار سیّد الابرار (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے کسی جگہ بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان کے جُرموں پر قتل کی سزا لاگو نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی اشارتاً کسی جگہ نفی فرمائی ہے۔ بلکہ یہ تو اَسرارِ نبوت کی بہار اور اعجاز کے راز کا مظہر ہیں۔

ان واقعات و روایات سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی پاک نگاہوں کے سامنے سے غیب کے تمام پردے ہٹا دیے ہو رہا تھے۔ گویا کہ آپ ﷺ کو صبحِ ازل سے لے کر شامِ ابد تک کی ہر

ایک شے پر پوری طرح خبردار کر دیا گیا تھا۔ نہیں تو آپ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں ہی اہلِ اسلام کے ہاتھوں متعدد کفّار و منافقین اور یہود مارے جاتے۔ مدینہ المنورہ میں ایک شریر و فتنہ پرور یہودی قبیلہ کے تمام جنگجو مردوں کا قتل کیا جانا، تو تاریخ کا ایک ناقابلِ تردید حصہ ہے۔ خود حضرت عکرمہؓ کے والد، ابو جہل اور بیسوں صحابہؓ کرام کے والد، بھائی اور بیٹے تہِ تیغ ہوئے تھے۔ بقول ان کے اگر نبیٔ پاک (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہمیشہ اسلام کے دشمنوں کی آئندہ نسلوں تک کا بھی انتظار کرنے کیلئے تیار ہوتے تھے۔ تو پھر جہاد و قتال کا تمام فلسفہ حکمت منہدم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیا ایک غیور و جسور قوم اس کا تصور بھی کر سکتی ہے؟

فعل بلا قول

عیسائی اور یہودی صدیوں سے دشمنی و قتل و غارت گری نبھاتے چلے آرہے تھے۔ یہودیوں کی تاریخ تو ہمیشہ سازش، بغاوت اور غلامی سے عبارت رہی ہے۔ مگر اوراقِ تاریخ یہ گواہی بھی دیتے ہیں کہ موقع ملنے پر عیسائیوں نے بھی ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھانے میں کبھی دریغ نہیں کیا تھا۔ لیکن طلوعِ اسلام کے بعد یہ حق دشمنی و مسلم کشی میں دو قالب و یک جان ہو گئے۔ مسلمانوں کے خلاف ان کا آپس میں یوں شیر و شکر ہو جانا انسانیت کا بہت بڑا المیہ ہے۔

اسلام کی آمد سے قبل یہودی ہر لحاظ سے یثرب پر چھائے ہوئے تھے۔ اس برتری و غلبہ کا اصل سبب یہاں کے دو قبائل اوس و خزرج کے درمیان طویل خانہ جنگی تھی۔ یہودیوں کا پیشہ زرگری، تجارت اور سودی لین دین تھا۔ انجام کار اہلِ یثرب ان کے بھاری مقروض ہو گئے تھے اور مغلوب و معتوب بھی۔ مذہبی اجارہ داری

کے علاوہ وہ فوجی اعتبار سے بھی قلعوں کے مالک اور مضبوط تھے۔

رسولِ کریم (ﷺ) نے جب ہجرتِ مدینہ اختیار فرمائی تو اس ماحول میں اخوت اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہونے لگی۔ اس چیز نے جہاں عرب معاشرہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا۔ وہاں اس سے یہودی مفادات پر بھی کاری ضرب لگی۔ یہیں سے ان کی باقاعدہ اسلام دشمنی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ مدینہ المنورہ میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کی سازشوں سے شروع ہو کر فتحِ خیبر تک پہنچتا ہے اور پھر حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ان کی اعلانیہ بغاوت شروع ہوتی ہے جو بظاہر سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت پر اختتام پذیر ہوئی۔

مؤرخ بتاتے ہیں کہ فیروز لؤلؤ یہودی تھا۔ بعض نے اسے عیسائی المذہب بھی لکھا ہے۔ مدینہ المنورہ میں غیر مسلموں کے داخلے پر پابندی کے باوجود وہ ایک خاص طریقہ سے شہر میں داخل ہوتا ہے اور نمازِ فجر کے دوران امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کو شہید کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے خنجر سے ڈرامائی انداز میں خود کو بھی ختم کر لیتا ہے۔ اس واقعہ میں ایک مشتبہ کردار ہرمزان کا تھا۔ عبداللہ ابنِ عمرؓ اسے طیش میں آ کر قتل کر دیتے ہیں، اور یوں اس کا پس منظر ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ فیروز لؤلؤ کا پابندی کے باوجود مدینہ شریف میں آنا، حضرت عمرؓ کو چکی بنانے کے بارے میں اشارتاً" دھمکی دینا" شہادت سے تین یوم پہلے احبار کعب کا روزانہ آ کر بتانا کہ ان کی زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ نیز فیروز لولو کا اپنے تئیں فوراً" ختم کر لینا ایک گہری سازش کا ضرور پتا دیتا ہے۔

پھر یمن کے شہر، صنعاء میں ایک یہودی خاندان سے عبداللہ بن سبا نامی فرد اٹھتا ہے۔ مسلمانوں کے حلقے میں دھیرے دھیرے یہ عقیدہ پھیلاتا ہے کہ ہر نبی کا کوئی وزیر یا وصی ضرور ہوتا ہے اور یہ کہ امامت، نبوت سے بھی اونچا مقام ہے۔ یہ سیدنا

حضرت علی المرتضیٰؓ کی دوستی کا دم بھرتا اور اس پردے میں دشمنی کے تمام حربے آزما جاتا ہے۔ اس کی ذہنیت کے لطف سے ہی جنگ جمل و صفین جنم لیتی ہیں۔ آگے چل کر اس سبائی گروہ نے بڑے گُل کھلائے ہیں۔ اس پیچ در پیچ سازش کی کڑیاں نور الدین زنگی کے خواف سے لے کر ترک عثمانیہ سلطان عبدالحمید کے اقدامات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ صلیبی جنگوں کا وہ طویل سلسلہ جو آج سے صدیوں پیشتر شروع ہوا تھا، بانداز دیگر اب بھی جاری ہے۔ تاریخ نے یہی ثابت کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے خلاف ایک ہیں، اور اس مشترکہ دشمنی کا کوئی اصول یا معیار ہرگز نہیں ہے۔

تحریکِ شماتت تو نیّرِ رسالت (ﷺ) کے نمودار ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ مدینہ کے یہودی قبائل آپ (ﷺ) کو ایذا دینے اور سبّ کرنے میں انتہائی سرگرم رہے۔ ازاں بعد دنیائے عیسائیت کی ایک معروف شخصیت، پرنس ارطاۃ والی کرک ایجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر لشکر کشی کا جامع منصوبہ تشکیل دیا تاکہ مدینہ منورہ پر قابض و مسلّط ہو کر گنبدِ خضرا کو شہید اور مکۂ معظمہ میں بیت اللہ کو مسمار و منہدم کر دے۔ کتبِ تواریخ میں مرقوم ہے کہ جب وہ سمندری راستے سے حملہ آور ہوا تو مسلمان مقابلے کے لیے میدان میں موجود تھے۔ اس کی افواج، اسلامی لشکر کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ ساحل پر اپنے جہازوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کی جانب بھاگ نکلے۔ مجاہدینِ اسلام نے انہیں پکڑ پکڑ کر تہ تیغ کیا لیکن ریجی نالڈ بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اذیت پہنچانا اور نورِ مجسم شفیع معظم (ﷺ) کی شانِ اقدس میں ارتکابِ گستاخی کرنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ۱۱۸۶ میں غالباً" تیسری بار اس نے مسلم تاجروں کے ایک قافلے کو لوٹا اور گرفتار کر لیا۔ جب اسے ان لوگوں کی رہائی کے لیے کہا گیا تو اس نے طعن آمیز جواب دیتے

ہوئے کہا کہ تم اپنے نبی پر بڑا ایمان رکھتے ہو، ان سے کہو کہ آکر تمہیں چھڑا لے جائیں"۔ کہتے ہیں کہ جس وقت سلطان صلاح الدین ایوبی تک ریجی نالڈ کی یہ گستاخانہ بات پہنچی تو انہوں نے قسم کھا کر اعلان کیا کہ اگر خداوندِ قدوس نے چاہا تو اس مردودازلی کو میں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کروں گا۔

صلیبی لڑائیوں کے دوران ایک مرتبہ ریجی نالڈ مذکور اور اس کے بیٹے قید کر کے مجاہد اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کے سامنے لائے گئے تو مردِ غازی سے اس کی تمام بداعمالیاں گنوائیں اور کہا کہ اس وقت میں اپنے آقا و مولا احمدِ مجتبیٰ حضرت محمدِ مصطفیٰ (ﷺ) سے مدد چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے اس کا سر قلم کر دیا، اور فرمایا کہ ہمارا یہ دستور نہیں ہے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ مارتے رہیں۔ یہ تو اپنی حد سے بڑھی ہوئی بداعمالیوں اور سرکارِ رسالت مآب (ﷺ) کے حضور گستاخی کی پاداش میں قتل ہوا ہے۔

اسلامی اُندلس میں عبدالرحمٰن الاوسط ایک انتہائی رحم دل اور روادار حکمران تھا۔ اسی عہد میں بہ تعدادِ کثیر نصرانی روز بروز حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہے تھے۔ اس پر پادری سیخ پا ہوئے۔ ان کو سخت غصہ آیا اور رنج ہوا۔ لہٰذا امیر عبدالرحمٰن کی رواداری و نرم دلی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائیوں نے منظم طریق سے شاتمتِ رسول (ﷺ) کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس بارے میں ایک مشہور مؤرخ و مبصر "دلین پول" بالوضاحت لکھتا ہے: "اُندلس میں عیسائیوں کو اپنے مذہبی رسوم آزادی سے ادا کرنے کی جو رعایت حاصل تھیں، یہاں ان کی کج رو فطرت کے باعث متضاد نتیجہ برآمد ہوا۔ اندلسی کلیساؤں کے پادری اپنے گزشتہ مذہبی اقتدار کی بحالی کے خواہاں تھے، لیکن دولت اسلامیہ کی فراخدلانہ و روادارانہ روش سے وہ اپنے پیروکاروں کو برانگیختہ و برافروختہ کرنے کے لیئے کوئی فعّال کردار ادا نہیں کرپا رہے تھے۔ لہٰذا پادریوں نے

اس بارے میں طویل سوچ بچار کے بعد ایک نیا فکر و عقیدہ تخلیق کیا۔ اس کا نچوڑ یہ تھا کہ مذہب کی اصل روح اور یسوع مسیح کی حقیقی منشا تکلیفیں اٹھانے میں مضمر ہے۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ اسلامی حکمرانوں کو مشتعل کر کے گوشت و پوست اور انسانی جسم کو اذیت پہنچائی جائے تاکہ تزکیہ روح ہو سکے"۔

اس انسانیت سوز تحریک کا بانی، قرطبہ کا ایک راہب، لوبو جئیس تھا۔ یہ اپنے راہبانہ طرز زندگی کی وجہ سے اپنے ہم مذہبوں میں نگاہ عقیدت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی متواتر کوشش سے چند غالی عیسائیوں اور مسیحی نوجوانوں میں یہ تحریک پنپ اٹھی اور رفتہ رفتہ اس نے خوب زور پکڑا۔ اس عقیدہ کی رو سے طے پایا کہ وہ اپنی روح کو پاک کرنے کے لیئے دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام (ﷺ) پر سبّ و شتم کریں۔

اسلامی قانون و حکومت میں شاتم الرسول (ﷺ) کی سزا قتل ہے۔ گویا تصوُّر یہ دیا گیا تھا کہ عیسائیت کے پیروکار نوجوان اپنے پیغمبر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تتبّع میں اپنی جان کو قربان کریں گے اور خداوندِ یسوع مسیح کے منظورِ نظر ٹھہر جائیں گے۔

بتایا جاتا ہے کہ شاتمتِ رسول (ﷺ) کی یہ تحریک امیر عبدالرحمٰن الاوسط کے عہد ۸۵۰ء میں شروع ہوئی اور اس کے فرزند و جانشین امیر محمد بن عبدالرحمٰن کے دور ۸۶۰ء میں اپنے انجام کو پہنچی۔ دونوں باپ بیٹے نے گستاخیٔ رسول (ﷺ) کی جسارت کرنے والوں کو ہمیشہ موت کے گھاٹ اتارا۔ دس گیارہ سال کے عرصے میں بہت سے شاتمانِ رسول (ﷺ) کو واصل فی النار کیا گیا۔ ہیرلیور مور اور این میری شمل نے تعداد بتائے بغیر ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں شاتمتِ رسول (ﷺ) کی پاداش میں ترپن (۵۳) عیسائی افراد کے

قتل کیئے جانے کا ذکر مندرج ہے۔ اسٹینلے لین پول کے بقول، ۸۵۱ء کے موسم گرما کے صرف دو مہینے سے بھی کم مدت کے اندر گیارہ (۱۱) گستاخانِ نبی (ﷺ) کو ہلاک کیا گیا تھا۔ ان میں مندرجہ ذیل بد بخت بھی موجود ہیں:

یولو جیئس: اندلس میں چلائی جانے والی تحریک شماتتِ رسول (ﷺ) کا بانی اور عیسائی پادری تھا۔ جس نے ۸۵۰ میں سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کی سرعام بے ادبی کرنے کی تحریک کا آغاز کیا۔ ۸۵۹ میں بالآخر اس کا سر قلم ہوا اور تب کہیں جا کر اس رسوائے عالم تحریک نے دم توڑا۔

فلورا: یہ قرطبہ کی ایک حسین عیسائی دوشیزہ تھی۔ اس نے گستاخیٔ رسالت کی تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا باپ مسلمان اور ماں عیسائی تھی۔ باپ کے وفات پا جانے پر ماں نے عیسائیت کے اصولوں کے مطابق اسے تعلیم دلائی اور متعصبانہ تربیت کی۔ پادری یولوجیس اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ فلورا کو جب ۲۴۔ نومبر ۸۵۱ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو اس نے ایک پُر درد مرثیہ بھی کہا۔ میری نامی ایک اور عیسائی لڑکی اس کی ہم مشرب و ہم خیال تھی۔ یہ دونوں، رسولِ پاک (ﷺ) کی شانِ زیبا میں پے در پے گستاخانہ کلمات بکتی تھیں۔ یہ بھی اپنی انھی بدکاریوں کی وجہ سے جہنم رسید ہوئی۔ یہ آئزک (جس کا آگے ذکر ہوا ہے) کی بہن تھی اور اپنے بھائی کے راستہ پر چل کر انجام کو پہنچی۔

○ پر فیکٹس: یہ گرجا گھر کا ایک پادری تھا۔ اس نے بھی آقائے مدنی (ﷺ) کے حضور بعض بیہودہ کلمات کہے تھے۔ اور از روئے شرع قاضیٔ وقت کے حکم سے اپنے منطقی انجام کو پہنچا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

○ راہب اسحاق: عیسائی النسل اور قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ کچھ دیر امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں کاتب کے طور پر نوکری کی۔ ازاں بعد عہدِ شباب میں ہی دنیا سے کنارہ کش

ہو کر حبانوس کی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گیا۔ متعصب پادریوں کے زیر اثر آ کر اس کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ اپنی جان دے کر بزرگی حاصل کرے۔ اس نے سرِ عام اپنے خُبثِ باطن کا اظہار کیا اور تاجدارِ مدینہ (ﷺ) کی بارگاہِ ناز میں واہیات بکی تھی۔ امیر عبدالرحمٰن نے مردود مذکور کی بابت بطورِ خاص حکم جاری کیا کہ اسے سولی پر لٹکا دیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کریں کہ لوگوں کے لئے عبرت ہو۔ قصہ کوتاہ راہب اسحاق کو پھانسی دینے کے بعد اس کی لاش کئی دن تک لٹکتی رہنے دی گئی اور وہ بھی یوں کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر۔ پھر اس ازلی بدبخت کی لاش جلا کر راکھ کو دریا میں بہا دیا گیا۔ یہ جون ۸۵۱ء کا واقعہ ہے۔

○ سانکو: اسحاق کی ہلاکت کے دو دن بعد ایک افرنجی عیسائی جس کا نام سانکو سینکو یا سانچو تھا، نے ارتکاب گستاخی کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ امیر عبدالرحمٰن کی فوج میں سپاہی اور یولوجیئس کا شاگرد تھا۔ اسے بھی اسلامی دستور کے مطابق پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی حرمت و ناموس میں بکواس کرنے پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

○ جرمیاس اور جانبتوس: کتبِ تواریخ میں مرقوم ہے کہ ۷ جون ۸۵۱ء بروز اتوار چھ راہب (جن میں ایک اسحاق کا چچا جرمیاس مذکور اور دوسرا جانبتوس جو اپنے حجرے میں تنہا مقیم رہتا تھا) قاضی کے پاس آئے اور کہا کہ ہم بھی اپنے دینی بھائیوں اسحاق اور سانکو وغیرہم سے الفاظ کا اعادہ کرتے ہیں اور پیغمبر حسن و جمال (ﷺ) پر سبّ و شتم کرنے لگے۔ ان کو بھی ان کے پیش رووں کی طرح وادیٔ جہنم میں پہنچا دیا گیا۔

○ سیسی نند: یہ بھی پر فیکٹس کی طرح سنت ایکس کلوس کے گرجا کا ایک پادری تھا۔ نبی کریم رؤف الرحیم (ﷺ) کی ذات بابرکات سے متعلق بے ادبی کا مرتکب ہو کر آتش دوزخ کا ایندھن بنا۔ اسے قتل کی سزا دی گئی تھی۔

○ پولوس: یہ سیسی نند کے گرجا میں شماس تھا۔ سیسی نند نے اسے بھی ذلت کی موت مرنے پر اکسا رکھا تھا۔ چنانچہ یہ ملعون و اخبث بھی اپنے مربّی کے قتل کے چار یوم بعد ۲۰۔ جولائی کو حضور سیدِ ہر عالم (ﷺ) کے خلاف زبان دراز کرنے کے باعث قتل کر دیا گیا۔

○ تھیوو و میر: شہر قرمونہ کا ایک جوان راہب تھا۔ اہانتِ رسول (ﷺ) کی پاداش میں اسلامی قانون کے تحت ذلّت ناک موت سے دوچار ہوا۔

○ آئزک: شاید جرمیاس اور جانبتوس وغیرہم کا ساتھی تھا۔ اس نے پرفیکٹس کی طرح قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر ارادتاً" ارتکابِ توہین کیا اور اسے فنا فی النار کیا گیا۔

یہ تھے وہ بدنصیب و خبیث افراد جو آقائے نامدار (ﷺ) کی شانِ اقدس میں گستاخی کے مرتکب ہوئے اور انہیں قتل و مصلوب کر دیا جاتا رہا۔ مُسلم مؤرخین نے اس دلآزار باب میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے لیکن مسیحی مورخین اسے ہمیشہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہے ہیں۔ تاہم لین پول نے بڑی حد تک غیر جانب داری اور انصاف کا مظاہرہ کیا اور لکھا ہے کہ "ہم اقرار و تسلیم کرتے ہیں کہ مذکورہ مسیحی شہدا راہِ راست سے بھٹکے ہوئے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنی قیمتی جانوں کو مفت ضائع کیا اور جو کچھ کیا فی الواقع بہت بُرا کیا تھا"۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ تحریکِ شماتتِ رسول (ﷺ)، کج فطرت و خود غرض پادریوں نے شروع کی تھی اور عموماً" انہی تک محدود رہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر پادری وغیرہم ہی اس جرم میں لقمۂ اجل بنے۔ عیسائی اس میں من حیث القوم ملوّث نہ تھے، بلکہ عوامی سطح پر ان کی پذیرائی نہ ہو سکی اور انصاف پرور مسلم حکمرانوں کے سبب سے ہی ان کی ایسی حرکات و سکنات کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا

جاتا رہا۔ غالباً" یہی وجہ ہے کہ امیر عبدالرحمٰن نے اس شیطانی تحریک کو ختم کرنے کے لئے عیسائیوں کی ایک کونسل بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ جس نے اپنے صدر نشین اور اشبیلہ کے مجتہدِ اعظم کی موجودگی میں یہ فیصلہ دیا کہ آئندہ اس راستے پر چلنے والوں کی جو شخص اِتّباع کرے گا، وہ خائن، مجرم اور خارج از مذہب سمجھا جائے گا۔ لیکن مفسد و مفتری طبائع نے اس حکم کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا اور وہ اپنے سرغنہ اور اس گھٹیا تحریک کے بانی لویو جئیس کی اقتدا میں اپنی روش پر ڈٹے رہے۔ اول الذکر "یولو جئیس" سب سے آخر میں امیر محمد بن عبدالرحمٰن کے عہد میں قتل ہوا اور اس کے ساتھ ہی شماتتِ رسول (ﷺ) کی یہ مکروہ تحریک ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی۔ یہ بدنام زمانہ تحریک ۸۵۰ء میں شروع ہوئی اور لیور مور کے بیان کے مطابق ۸۵۹ء میں لویو جئیس کو ہلاک کر دیئے جانے پر اختتام کو پہنچی۔ قرآنی آہنگ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹ جانے کے لئے ہے۔

تحریکِ شماتتِ رسول (ﷺ) کے اس تجربہ کے قریباً" ایک ہزار سال بعد برصغیر پاک و ہند میں یہ عمل ایک اور انداز سے دہرایا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اندلس میں بلاواسطہ توہینِ رسالت کی گئی اور ہندوستان میں بالواسطہ یعنی ہندو مت کے احیاء کے نام پر۔ اندلس میں اسلامی عدالتوں کے ذریعہ شاتمانِ نبی (ﷺ) اپنے انجام کو پہنچتے رہے مگر خطۂ ہند میں اس وقت مکمل طور پر انگریز کی عملداری تھی۔ لہٰذا مروّجہ قانون کی رو سے فریاد رسی کی توقّع عبث تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ ناموسِ نبی (ﷺ) پر حملہ آور ہونے والوں کو باقاعدہ فرنگیوں کی اشیرباد حاصل تھی۔

آریہ سماج تحریک کی بنیاد کاٹھیاواڑ (گجرات) کے ایک برہمن "مول شنکر" نے رکھی۔ اسے بعد میں سوامی دیانند سرسوتی کہا جانے لگا۔ شخصِ مذکور کے تمام تحریکی مقاصد زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ اس کے بطن سے ہی شدّھی اور سنگھٹن دو اور

تحریکوں نے جنم لیا۔ شُدّھی کا مقصد یہ تھا کہ پاک و ہند کے مسلمانوں کو تبلیغ و تحریص سے دوبارہ ہندو بنا کر شدھ (پاک) کیا جائے۔ جہاں یہ ممکن نہ ہو سکے وہاں سنگھٹن کے ذریعہ یعنی بزورِ طاقت تبدیلیٔ مذہب کو یقینی بنا دیں یا پھر ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ آریہ سماجی دین اسلام پر ناروا حملے کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ توہینِ رسول (ﷺ) ان کا وتیرہ بن گیا تھا۔ ہر صبح نئے فتنے جگا جاتی اور ہر شام اہانت کا کوئی نہ کوئی اندوہناک باب رقم کرتی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس کا حرف حرف دلخراش اور ایک ایک واقعہ زہرہ گداز ہے۔ آریہ سماجی ہندوؤں کی تحریریں اور تقریریں گالی گلوچ اور سبّ و شتم سے بھری ہوئی تھیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب ہندوستان کے طول و عرض میں آریہ سماجیوں نے سرکارِ ہر عالم (ﷺ) کی شان میں یاوہ گوئیوں کا سلسلہ شروع کیا تو مسلمانانِ ہند کی طرف سے کیا ردِّ عمل سامنے آیا۔ ملّتِ اسلامیہ کے پیرو جوان زخم شمار کرتے رہے یا فکر درماں بھی کیا؟ مصلحت کوشی مصلحت پسندی کی روش اختیار کر لی کہ صداقتوں کے امین بنے؟ قلم کس نے پکڑا اور خنجر کس کس کے ہاتھ میں تھا؟ وہ کون خوش قسمت تھے جن کے مقدس لہو کے قطرے پوری قوم کو اس تلخ امتحان میں سرخرو کر گئے؟ سچ تو یہ ہے کہ نذرانہ جان پیش کرنے والوں کا تعلق دبستانِ علم سے نہیں مکتب جنوں سے تھا۔ چراغِ محبّت انہی کے سینوں میں روشن ہوتا ہے جو دیوانے ہوں۔ عشق ہر امتحان میں ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ ایمان، عشقِ رسول (ﷺ) ہی کا تو نام ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ گستاخِ مصطفیٰ (ﷺ) اپنی انگلی اٹھا بھی نہ پاتا کہ شمعِ رسالت کا کوئی نہ کوئی پروانہ اس کو کاٹ کر رکھ دیتا۔ سرفروش مجاہد اپنے خنجروں کی پیاس بجھانے کو آگے بڑھتے رہے۔ یہ اسلامی غیرت اور اپنے آقا و مولا (ﷺ) سے بے پایاں عشق و محبت کی خوبصورت روداد ہے۔

○ غازی عبدالرشید شہیدؒ: انہوں نے دسمبر ۱۹۲۶ میں تاجدارِ مدینہ (ﷺ) کے ایک گستاخ ہندو سوامی شردھانند کو دہلی میں کیفرِ کردار تک پہنچایا اور خود جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔

○ غازی علم الدین شہیدؒ: شمعِ رسالت کے اس نوعمر پروانہ نے ۶۔ اپریل ۱۹۲۹ کو لاہور میں راجپال مردود کا کام تمام کیا جو کہ ایک مدت سے سرکارِ رسالت مآب (ﷺ) کے مقام و مرتبہ پر حرف گیری کر کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا۔ غازی مذکور ۳۰۔ اکتوبر کی درمیانی رات میانوالی جیل میں درود و سلام کا ملکوتی نغمہ الاپتے ہوئے تختۂ دار پر جھول گئے تھے۔

○ غازی عبدالقیوم شہیدؒ: رسولِ پاک (ﷺ) کے اس عاشقِ صادق کے سفرِ عقیدت کا آغاز ۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۴ کو کراچی سے ہوا تھا۔ جب انہوں نے ایڈیشنل جوڈیشنل کمشنر کی عدالت میں نتھو رام کی گندی زبان کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا اور خود ۱۹۔ مارچ ۱۹۳۵ کی ایک صبح پھانسی کے پھندے کو چوم کر اپنے آقا و مولا (ﷺ) کے قدومِ میمنت لزُوم سے لپٹ گئے۔ صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!

○ غازی محمد صدّیق شہیدؒ: ۱۷۔ ستمبر ۱۹۳۴ کا واقعہ ہے کہ اس مجسمۂ غیرت و پیکرِ حُرّیت نے ایک دہن دراز ہندو ملیچھ پالا مل سنار کو مقبرہ بابا بلھے شاہؒ کے بالکل قریب موت کا مزہ چکھا دیا۔ مقتول مردود اہانتِ رسول (ﷺ) کا مرتکب ہو چکا تھا۔ ۶۔ مارچ ۱۹۳۵ بروز بدھ یہ اکیس سالہ نوجوان آنکھوں میں مقدس چمک، دل میں تصورِ جاناں اور اپنے ہونٹوں پر درود سلام کے گلدستے لئے دار و رسن کی رسم نبھا رہا تھا۔ رسولِ عربی (ﷺ) کی حرمت و تقدّس کا یہ غیور محافظ قصور میں مدفون ہے۔

○ غازی میاں محمد شہیدؒ: مدراس میں سینٹ تھامس ماؤنٹ چھاؤنی کی کوارٹر گارڈ کی

○ غازی محمد منیر شہیدؒ (موضع موگر ضلع فیروز پور / بھارت پنجاب) غازی محمد حنیف شہیدؒ (بھوپال) غازی غلام محمد شہیدؒ (جہلم) اور غازی اللہ دتہ شہیدؒ (کنجاہ / گجرات) بھی وفا کی کتاب ہی کا ایک حسین باب ہیں۔

اندلس و ہند میں مندرجہ بالا واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ مسلم علما، سلاطین اور عوام روز اول ہی سے اس بارے میں کس قدر حسّاس ہیں۔ اس کے باوجود ایک نامانوس آواز آج کل عامۃ الناس کو سلجھا اور چونکا رہی ہے:

"یہ مسئلہ (قتل گستاخِ رسولؐ) دین میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کے لیئے نہ قرآن و حدیث میں کوئی صریح نص موجود ہے اور نہ رسول اللہ (ﷺ) کے عمل سے اس کی تصدیق ملتی ہے۔ مزید یہ کہ اس مسئلہ کو بجنسہٖ ماننے کی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پوری اسلامی تاریخ میں تمام علماء اور سلاطین مسلسل اس شرعی حکم کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ خلاف ورزی کرنے والوں کی اس لمبی فہرست میں نعوذُ باللہ خود رسول (ﷺ) اور اصحابؓ رسول (ﷺ) بھی شامل ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ اندلس میں قاضیوں کی عدالت سے گستاخِ رسول (ﷺ) کی سزائے موت پر متواتر عمل درآمد ہوتا رہا۔ کیونکہ اس بارے میں مصدقہ اسلامی مواد کا ایک ذخیرہ موجود ہے، اور برِّصغیر پاک و ہند میں انگریزی تسلّط کے سبب علماءِ دین نے شاتمانِ رسول (ﷺ) کے قتل سے متعلق باقاعدہ فتوے صادر کیئے اور جانثارانِ مصطفیٰ ﷺ نے اپنی جانوں پر کھیل کر اس کا نفوذ یقینی بنایا۔ حزب الاحناف (لاہور) سے موقع بہ موقع ایسے کئی ایک فتاویٰ یادگار ہیں۔ شیرانوالہ گیٹ اور دیگر مکاتبِ فکر و مسالک کے علماء ان کی تائید میں تھے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اس وقت بھی شاید ایسا کوئی "مردوجیہ" موجود ہو، جسے غیرت و حمیت کا

ڈیوٹی نبھانے والا یہ مسلمان سنتری ایک ہندو ڈوگرے سپاہی چرن داس کو جہنم میں جھونک کر عشق و وفا کے امتحان میں کامیاب ٹھہر گیا اور ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۸ کو شہادت سے سرفراز ہوا۔ مدراس ریلوے اسٹیشن سے تین میل دور واقع ایک بڑے قبرستان میں حضرت دستگیر ساویؒ کے مقبرہ اور مسجد کے درمیان ذرا بائیں جانب سطحِ زمین سے کافی اونچے چبوترہ پر ان کی آخری آرام گاہ آج بھی ثبوت وفا کے طور پر موجود ہے۔

○ غازی محمد عبداللہ شہیدؒ: خانقاہ ڈوگراں (شیخوپورہ ضلع) سے قریب چک ۱۲۴ خورد میں ایک نوجوان عاشقِ رسول (ﷺ)، قصور سے آیا اور اس نے غازی و شہید کا مقام و مرتبہ پایا تھا۔ انہوں نے ایک بدقسمت و مردود ازلی چلچل سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار کر عاشقانِ مصطفیٰ (ﷺ) میں اپنا نام لکھوایا اور بارگاہِ نبوی (ﷺ) سے انعام پایا تھا۔

○ غازی مرید حسین شہیدؒ: ۸۔ اگست ۱۹۳۷ء کا سورج ڈوب رہا تھا۔ ضلع حصار (بھارت) کے قصبہ نارنوند میں شہباز عشق اپنے شکار پر جھپٹا۔ وٹنری ڈاکٹر رام گوپال اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ۲۴۔ ستمبر ۱۹۳۷ء بروز جمعۃ المبارک، سرکارِ خیر الانام (ﷺ) کا یہ جانثار بوسۂ نعلین پاک سے سرفراز ہوا۔ ڈاکٹر مذکور نے امام الانبیاء (ﷺ) کی حرمت و تقدیس کا تمسخر اڑایا تھا۔

○ غازی امیر احمد شہیدؒ اور غازی میاں عبداللہ خاں شہیدؒ کا تعلق لاہور سے تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے دونوں ترکھان، بلحاظِ عمر نوجوان تھے۔ شمعِ رسالت کے یہ پروانے غازی علم الدین شہیدؒ کے عزیز بھی بتائے جاتے ہیں۔ ۷ مئی ۱۹۳۱ء کی دوپہر گستاخِ رسولؐ ہندو پبلشر بھولا ناتھ سین کو موت سے دوچار کیا اور یوں اپنی وفاؤں کا زریں باب رقم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ۹۔ مارچ ۱۹۳۲ کو مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے اور کلکتہ میں مدفون ہیں۔

اظہار اور جاں سپاری و فدا کاری کا کردار پسند نہ تھا۔ امرِ صادق یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی پوری تاریخ میں اس شرعی حکم کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ یہ تو دانشِ افرنگی کا غبار ہے کہ عہدِ حاضر میں بعض مسلمان بھی دین کے اس اساسی و مطلق حکم کو بدلنے اور کچلنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

اس باب میں کئی نظائر ہاتھ لگتے اور وجہِ بصائر ٹھہرتے ہیں۔

○ ابو عبداللہ بن عتاب نے اس عشار (وہ شخص جو حکومت کی طرف سے عشر کی وصولی پر مامور ہو) کے بارے میں قتل کا فتویٰ دیا تھا' جس نے عشر وصول کرتے وقت ایک شخص سے کہا کہ عشر تو پہلے ادا کر دو اس کے بعد شکایت کرنی ہو تو رسول اللہ (ﷺ) سے شکایت کر دینا۔ میں نے اگر عشر طلب کیا ہے تو اس لئے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے طلب کیا۔ اگر میں جاہل ہوں تو (معاذ اللہ) رسول اللہ (ﷺ) بھی جاہل تھے۔ کیونکہ انہوں نے بھی عشر طلب کیا تھا۔

○ فقہائے اندلس نے بالاتفاق ابن حاتم طیطلی کے قتل اور سُولی دینے کا فتویٰ دیا تھا' جس نے ایک مناظرے کے دوران نبیٔ اکرم (ﷺ) کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے رسول اللہ (ﷺ) کو یتیم (حقارتاً) حضرت علیؓ کا خسر کہا تھا' اور اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ آپ ﷺ کا زہد اختیاری نہیں بلکہ اضطراری تھا۔ اگر آپ ﷺ کو دنیوی نعمتیں میسر ہوتیں تو آپ ﷺ ان کو استعمال کرتے۔ (مطلب یہ کہ پھر اس طرح کا زہد نہ ہوتا) (نعوذ باللہ)

○ قیروان کے فقہاء اور سحنون کے شاگردوں نے ابراہیم فزاری کے قتل کا فتویٰ دیا تھا۔ (یہ بہت سے علوم میں ماہر ایک شاعر تھا) اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنے بہت سے اشعار میں سرکارِ ہر عالم (ﷺ) اور دیگر انبیاء کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اسے قاضی یحییٰ بن عمر کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت عدالت میں دوسرے

بہت سے نامور فقہا تھے۔ قاضی نے اس کی پھانسی اور قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ میں چھری گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا۔

○ عباسی خلیفہ موسیٰ بن مہدی المقلب بہ ہادی کے دور میں ایک شخص نے قبیلہ قریش کو برا بھلا کہا۔ یہ رسول اللہ (ﷺ) کی نسبت سے تھا۔ اور اس سلسلے میں حضورِ اقدس (ﷺ) کی ذات بابرکات کے متعلق بھی ہرزہ سرائی کی۔ وہ ہادی کے سامنے لایا گیا۔ اس نے علماء و فقہاء کو جمع کر کے ان سے فتویٰ چاہا۔ انہوں نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ اس پر خلیفہ نے کہا کہ اس کی سزا کے لئے یوں قریش کی اہانت ہی کافی تھی۔ اس دشمنِ خدا نے تو رسول پاک (ﷺ) کو بھی شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

○ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے عہد میں ایک شاعر نے اس مضمون کو باندھا کہ دینِ اسلام کی تمام تر ترقی محض رسولِ پاک (ﷺ) کی ذاتی کوششوں کا ثمر ہے۔ وگرنہ اس میں ہرگز تائید الٰہی یا دین کی حقانیت شامل نہ تھی' تو اس پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم سے اس کی سرِعام گردن کاٹ دی گئی تھی۔

ان مستند تاریخی مثالوں اور حوالوں کے باوجود ایک شخص یہ کہتا ہے "رسول اللہ (ﷺ) کے زمانہ سے لے کر اب تک کبھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس عرصہ میں بعض استثنائی افراد ضرور قتل کیئے گئے ہیں' جن کے ساتھ دوسرے اسباب مثلاً نقضِ عہد (غدر اور بغاوت) کا جرم شامل تھا۔ مگر مجرّد لفظی ایذا رسانی کی بنیاد پر اس قسم کے قتل عام کا نہ کبھی کسی عالم نے نامزد فتویٰ دیا اور نہ کبھی کسی حاکم نے اس پر عملدر آمد کیا"۔

آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اس دعویٰ کی بنیاد مبنی بر صداقت ہے؟ صداقت تو یہ ہے کہ ایسی باتیں اور گھاتیں جھوٹ کا پلندہ اور دجل و فریب کا پھندا ہیں۔ یہ ایک

دام ہمرنگ زمیں ہے جو بظاہر بڑا حسین ہے۔

رُشدی کا پس منظر

عہدِ حال میں رسولِ پاک (ﷺ) کی حیاتِ طیبہ اور دینِ اسلام پر سب سے بڑا حملہ "شیطانی آیات" ہے۔ مجہول النسب سلمان رُشدی ۱۹۴۷ء میں بمبئی کے ایک مادیت گزیدہ گھرانے میں پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اپنے والدین کے ہمراہ کراچی آگیا تھا۔ لیکن دوبارہ بمبئی چلا گیا۔ اس کے بہت سے رشتہ دار اب بھی پاکستان میں ہیں۔ ان میں جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں وفاقی وزیر میجر جنرل (ریٹائرڈ) شاہد حامد، بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔

سلمان رُشدی کیمبرج یونیورسٹی میں بھی زیر تعلیم رہا اور تاریخ کے مضمون میں ڈگری لی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے اسلام کا مطالعہ کیمبرج میں زمانہ طالب علمی کے دوران کیا اور میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا تھا کہ اسلامی تاریخ کو سامنے رکھ کر ایک ناول لکھوں گا، جس کے کردار علامتی ہوں گے۔

ملعون رشدی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے تیئں ادبی حلقوں میں نہ منوا سکا تو اس نے ایڈورٹائزنگ کا پیشہ اختیار کر لیا، اور ساتھ ساتھ اخبارات میں بھی لکھنے لگا۔ تاہم اس کے کرائمز، مڈنائٹ چلڈرن اور شیم کو سنسنی خیزی اور بے ہودہ گوئی کے سبب پڑھا گیا۔ فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ مغرب کی اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہوگی کہ سلمان رشدی ایسا گنوار، برطانیہ کے معروف ناول نگاروں میں سے ایک ہے۔

شیطان رُشدی اب اپنی انگریز بیوی، میریانے وگنس (Marianne Wiggins) کے ساتھ لندن میں رہتا ہے اور روپوشی کی زندگی گزار

رہا ہے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو برطانوی پبلشر وائکنگ پریس (Viking Press) نے اس کی ایک بدنامِ زمانہ کتاب شیطانی آیات (The Stanic Verses) ریلیز کی تھی۔ یہ ۵۴۷ صفحات پر مشتمل ایک ناپاک دفتر ہے۔

مردود رشدی نے اس رسالے کا نام ہی گستاخانہ تجویز کیا۔ وہ دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کے خلاف ایک انتہائی بے ہودہ اور فحش قسم کا ناول ہے۔ اس میں سید الشہدا حضرت حمزہؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے نام تو اصل حالت میں درج کر دیئے گئے ہیں جب کہ ناول میں اساسی کردار کو محاونڈ (Mahound) لکھا گیا ہے۔ خاکم بدہن، جو کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) کے نامِ نامی اسمِ گرامی "محمد" کو بگاڑ کر بنایا گیا ہے۔ قدیم دور میں مستشرقین اور یورپ کے مسیحی علماء نے خبثِ باطن کے تحت آپ ﷺ کے اسمِ مبارک کو طرح طرح سے بگاڑا تھا؟ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

"شیطان کی شیطانی آیات" اسلام اور پیروکاران اسلام کے خلاف ایک واضح سازش ہے۔ چونکہ یہ سازش "بڑی طاقتوں" کے تخیل کا عملی اظہار تھا، اسلیئے مغربی ذرائعِ ابلاغ ابھی تک اس کی حمایت میں ہیں۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی کے ایک لیڈر مائیکل فٹ نے سلمان رشدی کے حق میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس پر اعتراض کرنے والے جاہل ہیں۔ اس بارے میں ایک صاحب رقم طراز ہیں:

"ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ عام طور سلمان رُشدی کو "اعداءِ اسلام" کی سازش سمجھتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ یہ اسلام کے خلاف اہلِ مغرب کی سازش ہے، جس نے سلمان رشدی کے قصہ کی صورت اختیار کی۔ میرے نزدیک یہ محض سطحی بات ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب مصنف کا ایک انفرادی فعل ہے نہ کہ مغربی ملکوں کا کوئی اجتماعی منصوبہ۔ موجودہ زمانہ کا

نام نہاد مسلم پریس اس بات کو بہت اچھالتا رہا ہے کہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد امریکہ اور اہلِ مغرب نے اسلام کو اپنے دشمن کے طور پر دریافت کیا ہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے سے پہلے مغرب جس طرح کمیونزم کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھا' اسی طرح اب اس نے اسلام کو اپنے نشانہ پر رکھ لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کو اپنے وجود کیلئے ایک عدُو درکار تھا' اشتراکی عدو کے خاتمہ کے بعد اس نے اسلامی عدُو کو ایجاد کر لیا ہے تاکہ عالمی سطح پر وہ اپنے بقا کی جدّوجُہد جاری رکھ سکے۔ مغربی تہذیب مقابلہ کے اصول پر قائم ہے' اور مقابلہ آرائی کیلئے ایک حریف لازمی طور پر ضروری ہوتا ہے۔ مگر یہ تمام باتیں محض اوہام اور مفروضات کا نتیجہ ہیں۔"

طرفہ تماشا یہ کہ خود موصوف نے اپنی ایک کتاب کے کئی صفحے یہ ثابت کرنے میں سیاہ کر دیے ہیں کہ اسلام کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کے یہ ہتھکنڈے بہت پرانے ہیں۔

پروفیسر حِتّی (Philip K. Hitti) پرنسٹن یونیورسٹی میں سامی ادب کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا ایک رسالہ اسلام اور مغرب ۱۹۶۲ء میں امریکہ سے شائع ہوا تھا۔ اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے یہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ رسالہ مذکور کے دو حصے اور ۱۹۰ صفحات ہیں۔ پہلے حصہ کے ابتدائی تین ابواب میں اسلام کا بلحاظ مذہب' ریاست اور کلچر تعارُف کروایا گیا ہے۔ "اسلام مغربی لٹریچر" اس کا چوتھا باب ہے۔ اس کے مطابق دین اسلام کے خلاف اہلِ مغرب کی بعض سازشی کڑیاں مندرجہ ذیل ہیں:

قرونِ وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں (نعوذُ باللہ) پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کو عام طور پر جعل ساز اور نقلی رسول کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ (ان کے

نزدیک) قرآن ایک بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریقِ حیات تھا۔

زرتُشت' بدھ ازم اور دوسرے کم ترقی یافتہ مذاہب سے کبھی اس طرح نفرت نہیں کی گئی اور نہ تحقیر روا رکھی گئی۔ دراصل وہ قرونِ وسطیٰ کے مغرب کیلئے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ اور نہ انہوں نے مقابلہ میں آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس لئے یہ بنیادی طور پر خوف' دشمنی اور تعصّب تھا' جس نے اسلام کے بارے میں مغرب کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا۔ اسلام کا عقیدہ ایک دشمن عقیدہ تھا۔ اس لئے اگر وہ غلط نہ ہو تو بھی شبہہ کی نگاہ سے دیکھا جانا ضروری تھا۔

قرونِ وسطیٰ اور اس کے بعد کی مسیحیت نے جس تحریری یا زبانی ذریعے سے اسلام کے بارے میں اپنا تصوّر قائم کیا' وہی تھا جو صلیبی جنگوں کے دوران وجود میں آیا یا ان ممالک کی معرفت ملا' جن سے اسلام کی لڑائی پیش آ چکی تھی۔ مسیحی علماء اور پادریوں نے اسی کے ذریعہ سے اسلام کی تصویر بنائی۔ اسلام کی اس یورپی تصویر اور اس کی حقیقی اسلامی تصویر میں کوئی مشابہت محض اتفاقی ہے۔

شام کے مشہور عیسائی عالم' سینٹ جان آف دمشق (۷۴۹ء) کو بازنطینی روایات کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ عہدِ جوانی میں بنوامیہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ عربی' سریانی اور یونانی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلام کو ایک بت پرستانہ مذہب کے طور پر پیش کیا۔ (نقل کفر کفر نباشد' اس نے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو مسلمانوں کا بُت کہا) اس کے بیان کی رو سے' حضرت محمد ﷺ نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول دین وضع کیے۔ یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک جھلک ہے۔

بازنطینیوں میں "تھیوفین" (Theophane) وہ پہلا شخص ہے' جس نے حضرت محمدِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا باقاعدہ ذکر کیا۔ یہ ایک خانقاہ کے بانی

اور مورخ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ یہ ۷۵۸ تا ۸۱۸ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو مشرقی باشندوں کا حکمران اور (نعوذ باللہ) ایک بناوٹی رسول لکھا ہے۔

عبدالمسیح بن اسحاق الکندی مشرق کا ایک عیسائی تھا۔ اسے سپین میں ایک سید زادہ مسلمان مبلّغ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ نے عرب سے اس عیسائی کو اکسایا کہ وہ عیسائیت کا دفاع کرے اور اسلام پر حملہ آور ہو۔ الکندی مذکور نے رسولِ عربی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو ایک قاتل وغیرہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ قرآن پاک محض مصنوعی الہامات کا مجموعہ ہے اور دینِ اسلام کو فریب، تشدّد اور نفس پرستانہ تعلیمات کی چاٹ دلا کر پھیلایا گیا۔

قرطبہ کے ایک بشپ ایولوگیس (Eulogius) نے اس مواد میں زہرناک اضافہ کیا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں صلیبی جنگوں کے ذریعہ اسلام کو مغلوب کرنے کی کوشش جب ناکام ہو گئی تو مسیحی، حلقوں میں ایک نیا رجحان ابھرا کہ اسلام کو تبلیغ و تحریص کے ذریعہ تباہ کیا جائے۔ لہٰذا اس کے لئے مشنری تحریک وجود میں آئی۔ اس دور کی سب سے بڑی مشنری تحریک ایک اسپینی تحریک تھی، جو ریمنڈیل نے شروع کی۔ اس کا زمانہ ۱۲۳۵۔۱۳۱۵ ہے۔ مگر اس کی مشنری سرگرمیاں بُری طرح ناکام ہو گئیں۔ بالآخر اس نے اسلام پر تابڑ توڑ حملے کرنا شروع کر دیے۔ وہ گلیوں میں نکل کر چلاّتا پھرتا تھا کہ عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے اور مسلمانوں کا غلط۔ ٹیونس میں ایک مشتعل مجمع نے اس پر حملہ کر دیا اور پتھر مارے، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

عیسائیت اور اسلام میں زبان کا اجنبی پن پہلی بار اس وقت ٹوٹا جب فرانس میں قرآنِ پاک کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ غالباً بیرونی زبان میں یہ قرآن کا پہلا ترجمہ ہے اور شاید ۱۱۴۱ میں ہوا۔ اس کے مترجمین میں ایک عرب باشندہ اور تین عیسائی

تھے۔ اس ترجمہ قرآن کے ساتھ ایک ضمیمہ بعنوان۔ "مسلمانوں کے عقائد کی تردید" بھی طبع کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ۱۶۴۹ء میں سیور ڈوریر (Sieur Duryer) نے اس ترجمہ کی مدد سے ہی قرآنِ مجید کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا اور ازاں بعد اسے محمد (ﷺ) کا قرآن "The Accoran Of Mahammad" کے نام سے انگریزی میں ڈھالا اور اچھالا گیا۔ اس ترجمے کی اشاعت کا حقیقی مقصد خود مترجم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ان تمام لوگوں کو مطمئن کردوں جو ترکی کے اس کھوکھلے مذہب (اسلام) کو جاننے سے خواہش مند ہیں۔

پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے نام مبارک کو بھی کئی طرح سے بگاڑ کر لکھا جاتا رہا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس کی اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ بناء بریں آپ ﷺ سے کئی ایک بگڑے ہوئے نام منسوب کر کے پھر ان کی مزید نقلیں تیار کی گئیں۔ یہ فہرست ستّر اسّی الفاظ کے لگ بھگ ہے۔ سیور ڈوریر نے سرورق کے لئے ایک ایسا ہی نام استعمال کیا تھا۔ دورِ جدید میں رُشدی مردود نے بھی اسی طرز میں اپنی رذیلی فطرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے بارے میں جھوٹے افسانوں کو پھیلانے میں الگزنڈر راس، مارٹن لوتھر اور جارج سیل بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، بلکہ اہلِ مغرب کو اسلام سے بدظن کرنے کی خاطر نت نئی عجیب و غریب کہانیاں تراشتے رہے۔

ایلزبتھ کے دور ایک نامور مصنف، فرانسس بیکن (Francis Bacon) نے اس قسم کے زہریلے مواد میں اضافہ کیا اور لکھا تھا: "محمد (ﷺ) نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑی کو بلائیں گے اور وہ ان کے پاس چلی آئے گی۔ لوگ جمع ہوئے۔ محمد ﷺ نے پہاڑی کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ وہ بار بار

پکارتے رہے اور جب پہاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی تو وہ ذرا بھی نہیں شرمائے۔ بلکہ انہوں نے کہا کہ اگر پہاڑی محمد ﷺ کے پاس نہیں آسکتی تو محمد (ﷺ) پہاڑی تک جاسکتے ہیں"۔

مغربی لٹریچر میں مسلمانوں کی کُتُب سے دشمنی کا باقاعدہ ایک پس منظر تیار کیا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک کبوتر کا مفروضہ تھا۔ اس مروجّہ داستان میں بیان کیا جاتا تھا کہ بانیٔ اسلام (ﷺ) نے ایک کبوتر کو تربیت دے رکھی تھی تاکہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لیئے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے مُتبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعہ سے روح القدس ان کو الہام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر دہرایا گیا کہ ہم اس کا تذکرہ انگریزی ادب میں شیکسپئر کے ایک کردار کی زبان سے سنتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ شیکسپئر سے بہت پہلے جان لڈگیٹ (John Lydgate) (۱۴۵۱) اس کبوتر کا رنگ بھی جانتا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ کبوتر' دودھیا سفید رنگ کا تھا۔ یہ جھوٹ اس قدر بولا گیا کہ اٹھارویں صدی میں کبوتروں کے ایک ماہر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک خاص قسم کے کبوتر کا نام مومت (Maumet) رکھ دیا' جو کہ سرکارِ مدینہ (ﷺ) کے لیئے عیسائیوں کے بگاڑے ہوئے نام کی ایک شکل تھی۔

جب یورپی باشندوں میں قدرے بیداری و بیزاری آنے لگی اور ان بہتانات کی طبعی عمر پوری ہوگئی تو ایک نیا طریقہ واردات ایجاد و دریافت کرلیا گیا۔ اب کوئی نانہجار و نابکار اٹھتا' اور عوام پر اپنی غیر جانب داری کا تأثر جمانے کے لیئے پیش رووں کے بہت سے الزامات کو جھٹلا دیتا۔ تاہم موقع بہ موقع خُبثِ باطن کا کوئی پوشیدہ مظاہرہ بھی کرجاتا۔ ان میں صلیبی دور کا ایک بشپ' ولیم آف ٹریپولی (William of Tripoli) جس کی پیدائش شام میں ہوئی تھی' نے ۱۲۷۰ء میں اسی

نوع کا ایک رسالہ لکھا تھا۔ ۱۶۷۹ء میں ایک انگلش پادری لانس لاٹ اڈیسن (Lance Lot Adison) اور اس کا ایک ہم عصر ہمفری پرائیڈکس (Hamphrey Prideux) بھی اسی قبیل کے فرد ہیں۔ جوزف وائٹ (White) (Josef) ولیم میور (Willim Myeor) اور سائمن آکلے کے یہاں بھی قدیم رجحانات کے آثار ملتے ہیں۔ تاہم ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کا انداز نسبتاً" کم جارحانہ تھا۔

والٹیر (Walter) نے بحیثیت مؤرّخ کسی حد تک احتیاط کا دامن تھامے رکھا مگر المیہ نگار کے روپ میں وہ تہذیب کے تمام بندھن توڑ اور شائستگی کے تقاضے ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس نے اپنے المیہ ناٹک (Tragedy) جس کا تعلق ۱۷۴۲ سے ہے' میں حقائق کا گلا بے دردی کے ساتھ گھونٹ دیا تھا۔ اس کے علاوہ جرمن شاعر گوئٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲) نے بھی پیدائشی طور پر سنی سنائی باتوں کو دہرانے کی روایت قائم رکھی۔ اس نے سرکارِ مدینہ (ﷺ) کی حیاتِ طیبّہ پر اپنے مخصوص رنگ میں ایک نظم شروع کی تھی مگر اسے مکمل نہ کرپایا۔ المختصر یہ کہ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی سیرتِ مقدّسہ کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی رہی اور دینِ فطرت کے انسانیت نواز اصولوں سے متعلق مغربی عوام کو متواتر گمراہ رکھنے کے لیئے کسی دور میں کسی قسم کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی۔

رُشدی کی جسارت کو مصنف کا انفرادی فعل کہنے والے یہی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کی مسیحی اقوام نے متحدہ طور پر یہ کوشش کی کہ وہ آپ ﷺ کی تصویر کو بگاڑیں اور آپ ﷺ کی تاریخ کو بالکل مسخ کر ڈالیں۔ مگر ہزار برس تک اپنی ساری طاقت خرچ کرنے کے باوجود ان کی کوشش صد فی صد ناکام ہوگئی۔ یہاں تک کہ سائنس کے زیرِ اثر خود علمِ انسانی میں

وہ انقلاب آیا جس نے آپ ﷺ کے معاندین کے پیدا کردہ لٹریچر کو غیر حقیقی قرار دے کر رد کر دیا۔ خود مسیحی طبقہ کی بعد کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ابتدائی نسلوں کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں ٹامس کارلائل پیدا ہوا جس نے آپ ﷺ کو تمام پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا (۱۸۴۹ء)۔ ان کے درمیان سے مائیکل ہارٹ اٹھا جس نے یہ اعلان کیا کہ محمد ﷺ تاریخ کے واحد سب سے بڑے انسان ہیں"۔

میرے خیال میں اس حوالے سے کارلائل کو ایک نئے سنگ میل کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ باطل یورپ کے صنم کدہ تصورات میں سچائی کی یہ ایک مؤثر پہلی آواز تھی۔ وگرنہ ڈاکٹر ہٹی ہمیں بتاتا ہے کہ عیسائی پادری اور مؤرخ کس طرح امام الانبیا (ﷺ) کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں لغو حرکتیں کرتے رہے۔ مگر یہ سلسلہ یہیں ختم ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ باندازِ دگر مزید آگے چلتا ہے۔ مقامی و بین الاقوامی طور پر یہ سلسلہ باہتمام باقی رکھا گیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ولیم میور کے طرز پر اب بھی کئی ایک ناول مغربی عزائم کے آئینہ دار ہیں۔ صیہونی منصوبے کی ایک کڑی "دی مہدی" (The Mahdi) ہے۔ اس ناول میں امریکہ اور برطانیہ وغیرہم کی مشترکہ سازش سے ایک ایجنٹ "ابو قادر" کو مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر امام مہدی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں ابھی شاہِ ایران اقتدار سے مضبوطی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا کہ اچانک مغربی مارکیٹ میں ایک ناول ۷۹ کا بحران (The Crash of 79) منظر عام پر آتا ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ عراق شط العرب پر مکمل قبضہ حاصل کرنے کے لیے رہواز اور ابادان پر حملہ آور ہے۔ سعودی عرب اور دوسری مسلم ریاستیں عراق کی امداد پر کمربستہ ہو گئی ہیں۔ ایران نے عراق پر جوابی حملے کر کے اس کے جنوب

مشرقی علاقے پر بھی حملے شروع کر دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ پورے خلیجی علاقے میں ایٹم تابکاری پھیلنے سے زبردست جانی اور مالی تباہی پھیل جاتی ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے تین سال بعد خلیج میں ایران و عراق کی واقعتاً" جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس میں حیران کن امر یہ ہے کہ بہت پہلے "ڈیلی ٹیلیگراف" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھ دیا تھا کہ یہ ہے تو ناول ہی، مگر کل کلاں یہ کمر توڑ دینے والی حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔

بناء بریں "ایلن ولیمز" کا ایک ناول مقدس ترین (Holy of Holies) بھی چھپ چکا ہے۔ اسے برطانیہ کی گرانا ڈا پبلشنگ کمپنی نے شائع کیا۔ اس میں اسلام کو کینسر کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے وجود سے کرۂ ارض کو نجات دلانے کے لیے ایک مہیب آپریشن کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ اس پروگرام میں روس، فرانس، برطانیہ امریکہ اور اسرائیل کی خفیہ تنظیموں کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ پانچ دیو قامت ہرکولیس جہاز جزیرہ قبرص میں جمع کیے جاتے ہیں۔ جن میں جوہری بموں کے علاوہ ایک خاص اعلان کا ٹیپ نصب ہے۔ اڑان سے پہلے مشن کے امکان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ایسے خوش قسمت افراد ہیں، جو مغرب کی تہذیب کے دفاع کی خاطر ایک غیر مہذب، جاہل اور ظالم طاقت "اسلام" کو تباہ کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہ کہ تاریخ میں وہ مغرب کے ہیرو قرار پائیں گے۔ ناول کے پلاٹ میں ہے کہ پانچوں طیاروں سے خفیہ جوہری بم پھٹتے ہیں اور قیامت کی سی تباہی آ جاتی ہے۔ حرم کعبہ اور مکۃ المکرمہ کا پورا شہر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ وہاں موجود تیس لاکھ حجاج میں سے پانچ لاکھ فوری طور پر لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔

مسعود کھدّر پوش کے ایک خط، مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور سے بھی اہلِ مغرب کی اس شیطانی جدوجہد اور خطرناک منصوبہ بندی کا لرزہ خیز انکشاف ہوتا ہے،

وہ لکھتے ہیں: "میں ۱۹۵۹ء میں امریکہ لیکچر دینے گیا۔ اس کے منتظم ایک یہودی لیکچر کمپنی کے سربراہ مسٹر سکانیک تھے، جو پاکستان میں چا پانچ ماہ قیام کر چکے تھے...... وہاں کئی یہودیوں نے مجھ سے ملاقاتیں شروع کر دیں، جن میں وہ بار بار یہ کہتے کہ دنیا جنگ کے خوف سے بہت پریشان ہے۔ ان حالات میں کسی "مہدی" کی شدید ضرورت ہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے سمجھاتے کہ آپ میں "مہدی" بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

آخر کار ایک روز تین حضرات میرے پاس نہایت ہی رازداری میں یہ بات کہنے آئے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آپ "مہدی" بن سکتے ہیں۔ اگر آپ کچھ عرصہ امریکہ میں ٹھہر جائیں تو ہم آپ پر دس لاکھ ڈالر لگا کر آپ کو "مہدی" مشہور کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو پاکستان اور ہندوستان کا دورہ کرایا جائے گا، اور آپ کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو جائے گی"۔

بعض افراد کا کہنا ہے کہ یورپی ممالک میں اربابِ کلیسا کو کب کا سیاسی اقتدار سے بے دخل کیا جا چکا ہے۔ اب ان کی بنیادیں سیکولرازم پر قائم ہیں۔ لہٰذا کسی مذہبی دماغ کی کارستانیوں کو اربابِ حکومت کے سر تھوپنا روا نہیں۔ حالانکہ یہ مؤقف بھی سراسر غلط اور لاعلمی کے سبب ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ عام طور پر اسلامی ممالک اپنے آئین سمیت "بنیاد پرست" ہیں، مگر عملاً" صد فی صد سیکولر، جبکہ یورپی دنیا اور بعض دیگر غیر مسلم ممالک بھی سیکولرازم کے مُدّعی و پرچارک ہونے کے باوجود شدید مذہبی ذہنیت رکھتے ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی ہم برطانوی ہند میں کئی بار دیکھ چکے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کی مجلس کے صدر مسٹر میکلز نے ۱۸۵۷ء میں برِّ صغیر پاک و ہند پر مکمل قابو پالینے کے فوراً" بعد انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "قدرت نے ہندوستان کی وسیع سلطنت انگلستان کو اس لئے

تفویض کی ہے کہ خداوندِ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک فاتحانہ لہرائے۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنی قوت صَرف کر دے تاکہ تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کا کام جاری رکھنے میں کسی وجہ سے کوئی تعویق نہ ہو سکے"۔

اسی دور میں سر ولیم میور کی کتاب حیاتِ محمدؐ (Life of Mohammad) منظرِ عام پر آئی جس کے بارے میں سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ولایت سے مولوی مہدی علی خاں کے نام بھیجے گئے ایک خط میں لکھا تھا: "ولیم میور کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا"۔

الغرض یہ کہ خطباتِ احمدیہ، اس کے جواب ہی میں شائع ہوئی تھی۔ ہندوستان میں مرزا غلام احمد کا دعویٰ نبوت اور ایران وغیرہ میں بابی تحریک کا آغاز مغرب کے اربابِ اقتدار کی منصوبہ بندی کا ہی آئینہ دار تھا۔ یہ یورپی دنیا کی اسلام دشمنی کا ایک مختصر خاکہ ہے، وگرنہ اس سے متعلق کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگ ان ناقابلِ تردید حقائق کو محض اوہام اور مفروضات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

"عہدِ حاضر کا مسلمان؟"

ہندوستان میں وحید الدین خاں، ایک مولانا ہوتے ہیں۔ عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کے نام پر ان کے متعدد رسائل طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے زیرِ ادارت ایک ماہنامہ بھی نکلتا ہے۔ حضرت سب کچھ ہیں: مفکّر، محقّق، دانشور اور ادیب۔ اپنے تئیں عقلِ کُل اور اپنی تعبیرات کو ایک طرح سے حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ ان کی

نگارشات میں اس امر کے واضح اشارے پائے جاتے ہیں کہ پوری تاریخِ اسلام میں گویا وہی فردِ وحید ہیں، جنہوں نے دین کی اصل روح کو سمجھا۔ کوئی سا دینی موضوع ہو ان کی تان دعوتی، تبلیغی اور تذکیری پہلوؤں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ ان کا نظریۂ جہاد محض دفاعی اور معذرت خواہانہ ہے۔ حکمتِ اعراض کے قائل اور خاموشی کی طاقت پر مائل ہیں۔ مصلحتِ دعوت میں وہ اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ دین بھی مصلحت کا دُم چھلاّ دکھائی دینے لگتا ہے۔

چند برس پہلے شیطان رُشدی کی کتاب "شیطانی آیات" مغربی سازش سے منظرِ عام پر آئی تو دیکھتے ہی دیکھتے فرزندانِ اسلام کے غیظ و غضب کا لاوا بہ نکلا۔ اسلامیوں نے حضور سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی اور بے مثال جذباتی تعلق کی ایک نئی مثال قائم کی تھی۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ راکھ کے ڈھیر میں اب بھی آگ پوشیدہ ہے۔ ستاروں نے گواہی دی کہ ایک مسلمان لاکھ بدکار ہو لیکن اپنے سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فداکار و جانثار ہوتا ہے۔ ابلیس کی مجلسِ شُورٰی میں ایک بار پھر ماتم برپا ہو گیا کہ ہر سازش اور حربہ کے باوجود ہنوز فاقہ کش کے بدن میں "روحِ محمد ﷺ" باقی ہے۔ دراصل یہ جذباتی رشتہ ہی ایمان کا اثاثہ اور قرآن کا خلاصہ ہے۔

سلمان رشدی کے خلاف غم و غصہ پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے وحید الدین خاں نے ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ایک پوری کتاب لکھ ماری۔ اس کا نام ہے "شتمِ رسولﷺ کا مسئلہ)۔ مولانا موصوف کے دعوٰی کے مطابق اسے قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں یورپی اخبارات، الیکٹرانک میڈیا، انٹرویوز اور اخباری بیانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ رسالہ ایک طرح سے قرآن و حدیث اور فقہ و تایخ کی دشمنی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ پوری کتاب

"غلامانہ آزادی" اور "آزاد غلامی" کا ایک عجیب و غریب درس ہے۔ فکری بالیدگیوں سے دور، غیر سنجیدہ و غیر متعلق آراء سے معمور۔ رطب و یابس سے بھرپور۔ ہر موضوع پر ان کی تحقیق کا یہی معیار ہے۔ ان کی جبینِ فکر مغرب آلودہ اور رُخِ قلم جدّت گزیدہ ہے۔ بس ان کے رسائل، ائمۂ مغرب کے حوالوں سے اجالوں کی آماجگاہ ہیں۔ ان کا نسخہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا پہلا جزو بلا عنوان (آغازِ کلام) باندھا گیا ہے۔ اس کے قریباً آغاز ہی میں لکھتے ہیں: ""عمرؒ بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ایسے مسلمان بہت تھوڑے ہوں گے جو پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کو محصل (Tax Collector) سمجھتے ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ میں تو بظاہر تمام مسلمان اسی سوچ کے ہو چکے ہیں"۔

کس قدر لغو اور باطل انداز ہے۔ اسے گستاخانہ بے باکی بھی کہا جا سکتا ہے۔ کُرۂ ارض میں بھلا وہ کون مسلمان ہے جو رسولِ اقدس (ﷺ) کو نعوذُ باللہ محصل سمجھتا ہو گا۔ اس پر عامیانہ پن یہ کہ نفسِ مضمون سے اس بات کا کسی طرح سے بھی کوئی تعلق نہیں بنتا۔

"حضرت" نے متعدد مقامات پر اس طرز کے کئی گُل کھلائے ہیں۔ ان کی حماقت کا ایک اور مظاہرہ ایک ذیلی سرخی "دونوں یکساں" کے تحت ملاحظہ فرمائیے، جو انہوں نے تیسرے باب میں متفرقات کے ربط سے قائم کی ہے:

"دونوں یکساں

مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۹-۱۹۰۸) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (۱۸۶۸-۱۹۴۸)۔ دونوں ہم عصر تھے۔ اس زمانہ میں جن علماء نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تحریری اور تقریری مقابلہ کیا، ان میں ایک مشہور نام، مولانا ثناء اللہ امرتسری کا بھی ہے۔

تردیدِ قادیانیت پر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ان کے مناظروں اور ان کی تحریروں اور تقریروں سے خود مرزا غلام احمد قادیانی تنگ آگیا۔ اس نے اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک تحریر لکھی۔ اس کا عنوان تھا۔ "مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ"۔ اس تحریر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے لکھا کہ: "مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت بدنام کیا۔ میرے قلعہ کو گرانا چاہا۔ اس لئے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے' وہ سچے کی زندگی میں مرجائے"۔ اس تحریر کے ایک سال بعد ۲۶۔ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال ہو گیا۔ دوسری طرف مولانا ثناء اللہ امرتسری مزید ۴۰ سال تک زندہ رہے اور ۱۵۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا (پاکستان) میں وفات پائی۔ اس طرح فیصلۂ خداوندی کے تحت ثابت ہو گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ جھوٹا تھا اور مولانا ثناء اللہ امرتسری اس کے مقابلہ میں سچ پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ مجھے ۳ جون ۱۹۸۹ کو یاد آیا' جب کہ ریڈیو نے اطلاع دی کہ ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی کا ۸۶ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آیت اللہ خمینی نے ۱۵۔ فروری ۱۹۸۹ء کو فرمان جاری کیا تھا کہ سلمان رُشدی کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے فوراً بعد حکومتِ ایران نے اپنے خزانے اور اپنے سرکاری ذرائع اس فرمان (یا فتویٰ) کی تعمیل کے لئے وقف کر دیئے۔ اس کے بعد دنیا بھر میں خمینی اور رُشدی کا معاملہ سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر کی حیثیت سے اخباروں میں چھپتا رہا۔ حکومتِ ایران نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ ایک خفیہ دستہ موت (Death Squad) اس قاتلانہ مشن پر روانہ کیا جا چکا ہے۔ حکومت ایران کے مکمل تعاوُن او دنیا بھر میں بے شمار شیعہ اور سُنّی مسلمانوں کی بھرپور تائید کے باوجود آیت اللہ خمینی اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ وہ سلمان رشدی کو قتل کرا دیں۔ یہاں تک کہ اپنے فرمان موت کے تقریباً چار مہینہ بعد خود آیت اللہ خمینی موت کا شکار ہو گئے۔

مذکورہ دونوں واقعات میں بعض فرق کے ساتھ ایک مشابہت ہے۔ اول الذکر واقعہ میں یہ ثابت ہوا تھا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری حق پر ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی باطل پر۔ ثانی الذکر واقعہ میں کسی قدر فرق کے ساتھ یہ ثابت ہوا ہے کہ اس کے دونوں ہی فریق باطل پر ہیں۔ سلمان رشدی بھی' اور اسی کے ساتھ آیت اللہ خمینی بھی۔

سلمان رُشدی کو تاریخی حقائق ثابت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف آیت اللہ خمینی اس لئے باطل قرار پاتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹے زعم کے تحت ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کا انہیں خدا نے حق نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں خدا کی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اپنی ساری مذہبی' سیاسی' اقتصادی اور عوامی طاقت کے باوجود سلمان رشدی کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔ قتل تو درکنار اقدامِ قتل کے درجہ کا بھی کوئی واقعہ وہ ظہور میں نہ لا سکے۔ یہاں تک کہ موت نے خود ان کا خاتمہ کر دیا"۔

مرقومہ بالا تحریر میں بے علمی' کم عقلی اور کج فکری کی بیسیوں باتیں در آئی ہیں۔ یہ اقتباس' تضادِ فکری کا ایک عجیب گورکھ دھندہ بن کر رہ گیا ہے۔ اول یہ کہ اس میں کہی گئی باتوں میں باہم کوئی مماثلت و مشابہت نہیں۔ دوم یہ کہ اس طرح کئی مشکل مقامات پیش نگاہ آجاتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ خدانخواستہ اگر مولانا ثناء اللہ امرتسری پہلے فوت ہو جاتے تو کیا مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے دعووَں میں سچا مان لیا جانا چاہئے تھا؟ ویسے بھی موت میں تقدم و تاخر کی بنیاد پر حق و باطل کے بارے میں امتیاز کرنا کون سی دانائی ہے؟ اس سلسلے میں سطحی و اَوسط ذہن کے لوگ انھی واقعات و شخصیات کو سچ اور جھوٹ کا معیار ٹھہراتے ہیں۔ اصل قوت اور حقیقی طاقت نظریات کی ہے۔ اور نظریہ یہ ہے کہ نبیِ آخر الزماں (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے بعد کسی مدعیِ نبوت سے دلیل طلب کرنا بھی کفر و منافقت ہے۔ "مولانا" کے طرزِ نگارش و استدلال

سے کچھ اس قسم کا تأثُّر ابھرتا ہے کہ جیسے ان کے خیال میں سلمان رشدی کا ابھی تک زندہ رہنا تائیدِ الٰہی سے ہے۔ امام آیت اللہ خمینی اس دور کے فتنۂ عظیم سلمان رُشدی کو ختم کرنے میں کسی طرح کامیاب ہو جاتے یا پھر اقدامِ قتل کے درجہ کا کوئی واقعہ ظہور میں لا سکتے تو کیا مولانا موصوف کا نقطۂ نظر اس رائے کے برعکس ہوتا؟ امرِ واقعہ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ رائے پہلے قائم کی گئی تھی اور مطالعہ بعد میں شروع ہوا۔ انہوں نے ہرگز تحقیق کی کوئی عمارت نہیں اٹھائی بلکہ زندہ حقیقتوں اور روشن عقیدتوں کے گلے پر باطل کی چھُری پھیرنا چاہی ہے۔ شاید وہ اسلامی عظمتوں اور تاریخی رفعتوں کو کذب گوئی کے مندر پر بھینٹ چڑھانا چاہتے ہوں۔ یہ گلۂ جفائے وفا نُما کی ایک ایسی روداد ہے کہ اگر کسی بت کدے میں بیان ہو تو صنم بھی "ہری ہری" کہ اٹھیں۔ درست ہے کہ تاریخ کے مختلف دوراہوں پر کعبہ کو صنم خانے سے پاسباں میسر آتے رہے ہیں، مگر یہ بھی کچھ غلط نہیں کہ صحنِ حرم میں غدّار بھی جنم لیتے رہے ہیں۔ سقوطِ بغداد اور زوالِ میسور کے زخمی اوراق نے اہلِ زمانہ کو یہ داستانِ غم کئی بار سنائی اور دہرائی ہے۔ وحید الدین خاں بھی اپنے قلم سے وہی کردار ادا کر رہے ہیں، جس سے بغداد، غیر آباد اور میسور، بے نوا ہوا تھا۔

ان صاحب کی اِس کتاب کو کسی طور بھی ایک علمی و تحقیقی یا کوئی سنجیدہ کوشش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِدھر اُدھر سے جو ہاتھ لگا، یہ اینٹ گارے کے طور پر استعمال میں لے آئے ہیں۔ یہ ایک جگہ ریاض کانفرنس کا فیصلہ کے ذیلی عنوان سے لکھتے ہیں: ۱۳-۱۶ مارچ ۱۹۸۹ کو ریاض میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کا اجتماع ہوا۔ اس میں ۴۶ مسلم ملکوں کے وزرائے خارجہ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے پر افغانستان کے مسئلہ کے بعد دوسرا سب سے زیادہ حساس مسئلہ، سلمان رشدی کے معاملہ پر اپنا فیصلہ دینا تھا۔ سعودی حکمران شاہ فہد کی

تقریر سے اس کا افتتاح ہوا۔ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر چند روزہ بحث کے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۸۹ء کو مسلم ممالک کے نمائندوں نے اپنے متفقہ فیصلہ سنایا۔

اس فیصلہ کے مطابق، ۴۶ ملکوں کی تنظیم اسلامی کانفرنس کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں ایران کے واحد اختلاف کے ساتھ "شیطانی آیات" کے مصنف سلمان رشدی کے خلاف آیت اللہ روح اللہ خمینی کے موت کے فتوے کو سختی سے مسترد کر دیا گیا۔ سفارت کاروں نے ایرانی فتویٰ کو مسترد کیے جانے کو انتہائی اہم اقدام قرار دیا۔

اس فیصلہ سے یہ ظاہر ہو گیا کہ رُشدی کے قتل کے فیصلہ میں ایران کی نام نہاد اسلامی حکومت تنہا ہے۔ بقیہ تمام مسلم ممالک، سرکاری سطح پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ رُشدی نے اگرچہ انتہائی قابل اعتراض کتاب لکھی ہے، اس کے باوجود یہ صحیح نہیں کہ مذہبی فتویٰ جاری کر کے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اکسایا جائے کہ اس کو جہاں پائیں قتل کر دیں۔ سلمان رشدی کا جواب ہمیں پرامن ذرائع سے دینا چاہیئے نہ کہ بم اور گولی سے"۔

اس کے بعد حضرت مولانا "ایک مغالطہ" کے تحت درجِ ذیل تبصرہ تحریر فرماتے ہیں: "سلمان رشدی کے بارے میں قتل کی وکالت کرنے والے جو مضامین شائع ہوئے، ان میں عام طور پر یہ الفاظ تھے کہ رشدی نے دنیا کے ایک بلین مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ یہ الفاظ بلاشبہہ خلافِ واقعہ ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جتنے خطوط اور مضامین چھپے ہیں وہ ۹۹ فی صد سے زیادہ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے "اردو خواں" مسلمان ہیں، جنہوں نے اس معاملہ میں پر شور حصہ لیا۔ حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں جو مظاہرے ہوئے ہیں، وہ بھی عملاً" وہاں بسنے والے ہندوستانی اور پاکستانی

مسلمانوں کی طرف سے تھے۔ ان ملکوں میں عرب ممالک یا دوسرے ملکوں کے جو مسلمان آباد ہیں، انہوں نے اس میں عملاً "اتنا کم حصہ لیا ہے کہ وہ تقریباً" نہیں، کے برابر ہے"۔

مرقومہ بالا اقتباسات سے جو چند نکات مترشح ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

○ ۴۶ مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس نے خمینی مرحوم کے فتویٰ کو سختی سے مسترد کر دیا تھا جس کا مطلب ہے کہ فتویٰ غلط اور غیر اسلامی تھا۔

○ رشدی کے قتل کے فیصلے میں ایران کی حکومت تنہا ہے۔ اور باقی اسلامی سربراہ اس رائے کے شدید ترین مخالف ہیں۔ لہٰذا امام خمینی جھوٹے اور دیگر سربراہان حکومت سچے ہیں۔

○ رشدی کے ناول سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی دلآزاری کا دعویٰ غلط ہے۔ ماسوائے پاک و ہند کے مسلمانوں کے کسی اور کلمہ گو کو اس سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

○ عرب ریاستوں اور یورپی ممالک کے فرزندانِ اسلام اس طرح کے نظری معاملات اور عملی اقدامات سے مکمل طور پر کنارہ کش ہیں۔ یہ تمام شور شرابا "اردو خواں" طبقے کا ہے جو کہ ناجائز اور جہالت کی پیداوار ہے۔

آہ! اس سنگ دل کو کون سمجھائے کہ تمہارے اندر کی بے حسی و بے حمیّتی کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ پوری ملتِ اسلامیہ بے غیرت ٹھہری۔ اور یہ کہ جن ممالک کے اربابِ حکومت کو تم حق کا معیار اور روشنی کا مینار ٹھہرا رہے ہیں، وہ تو باطل کا پلندا اور گھٹاٹوپ تاریکی کا ستون ہیں۔ بدقسمتی سے دنیائے اسلام کا قریباً" ایک ایک حکمران بے ضمیر و بے غیرت ہے۔ یہ تو اپنے اپنے عوام کے جذبات و احساسات کے ترجمان بھی نہیں ہیں۔ ان کو قرآن کا عرفان کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ خداوندِ قدوس کے باغی اور امریکہ کے بندے ہیں۔ رنگین اور سنگین، عیاش اور تماش بین۔

مزید بر آں یہ کہ حکمرانوں کے رویّہ و عمل کو دین کی روح یا اسلام کی فطرت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دینِ اسلام کا اساسی مسئلہ ہے اور اس کے لیئے دین ہی کو نمونہ ٹھہرایا جانا چاہیے۔

"مولانا" وحید الدین خاں نے رسالہ میں کئی جدید و قدیم سوالات اٹھائے ہیں۔ اکثر لایعنی، بعض بے معنی اور دو ایک بامعنی۔ ان کے طولِ کلام میں سے صرف چند سطور، معقولیت پر مبنی ہیں۔ گو یہ پہلو ان کی تضاد فکری کا عکاس ہے، لیکن میرے نزدیک لائقِ توجّہ اور قابلِ بیان ہیں۔

○ "حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی موت آپ مرجاتی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں ..... اس کتاب کے بارہ میں صحیح ترین ردِّعمل وہ ہے جس کی راہ نمائی خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے ایک قول میں ملتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ باطل کو ہلاک کرو، اس کے بارے میں چپ رہ کر..... باطل کو باطل جانتے ہوئے بھی بعض اوقات ضروری ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کرلی جائے"۔

○ "سلمان رشدی کی کتاب ستمبر ۱۹۸۸ میں شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں آیت اللہ خمینی کا قتل کا فتویٰ فروری ۱۹۸۹ء میں لوگوں کے سامنے آیا۔ اس کے بعد وہ شور و غل شروع ہوا جس کے نتیجہ میں برطانوی حکومت نے سلمان رشدی کو خفیہ مقام پر منتقل کر دیا۔ اور اس کے اوپر خصوصی پہرہ بٹھا دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد تقریباً" چھ مہینے ایسے گزرے ہیں جب کہ سلمان رشدی ایک عام آدمی کی طرح تھا اور ہر شخص اس کے اوپر قابو پا سکتا تھا۔ مگر اس پوری مدت میں لفظی بیان کے سوا کسی مسلمان نے کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سلمان رشدی روپوش ہو کر پولیس کے خصوصی پہرے میں چلا گیا"۔

○ "خود ایران کے آیت اللہ خمینی کو اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ

سنجیدہ ہوتے تو یقیناً وہ وہی کرتے جو اس طرح کے مواقع پر دوسرے لوگ ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع سنجیدہ ہوتے تو اخباری اعلان کے بجائے وہ ایسا کرتے کہ ایک یا چند آدمیوں کو نہایت خاموشی کے ساتھ انگلینڈ روانہ کرتے اور اسی کے ساتھ ان کے گھروالوں کو اتنی رقم دے دیتے کہ بحالتِ ضرورت وہ اپنی آئندہ معاش کے لئے مطمئن ہو جائیں۔ مگر آیت اللہ خمینی نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ اخبار اور ریڈیو پر اپنے قتل کے فرمان کو نشر کرنے لگے۔ گویا ان کی اصل دلچسپی اپنے فرمان قتل کی پبلسٹی سے تھی نہ کہ خود رشدی کے قتل سے"۔

○ "۱۷ فروری ۱۹۸۹ کی صبح کو جو اخبارات آئے' ان سب کے صفحۂ اول پر یہ سنسنی خیز خبر تھی کہ ایران کے شیعہ رہنما آیت اللہ خمینی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ شیطانی آیات (The Stanic Verses) کے مصنف سلمان رشدی (۴۲ سال) کو قتل کر دیں۔ اسی کے ساتھ ایرانی حکومت نے قتل کرنے والے کے لئے انعام کا بھی اعلان کیا۔ ٹائمز آف انڈیا (۱۷ فروری ۱۹۸۹) کے مطابق قتل کرنے والا اگر ایرانی ہے تو اس کو دو ملین ڈالر دیئے جائیں گے اور اگر قتل کرنے والا غیر ایرانی ہے تو اس کو ایک ملین ڈالر (1 Million) ملے گا۔ ایران کے خود ساختہ لغت میں اسلام بھی ایرانی اور غیر ایرانی ہو گیا"۔

○ "پاکستان کی خاتون وزیر اعظم (بے نظیر بھٹو) نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملہ کو طول دینے سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ توہینِ عقیدہ کو دہرانا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسے بجائے خود توہین کرنا۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کے مدِ نظر میرے خیال سے بنیاد پرست مذہبی لوگ بھی رشدی کے ناول اور اس کے قابل اعتراض موضوعات کی تشہیر کر کے اسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب رشدی نے کیا ہے"۔

منقولہ بالا اقتباسات سے وحید الدین خاں کا منتشر الخیال ہونا بھی عیاں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر خمینی صاحب کے فتویٰ یا کسی اور مسلمان کی جدوجہد سے رشدی موت سے دوچار ہو چکا ہوتا یا اب ایسا ہو جائے تو کیا موصوف اسے دینی تقاضوں سے ہم آہنگ مان لیں گے؟

قول بلا فعل واقعی اسلامی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ فعل بلا قول بہر طور افضل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا موصوف نے اپنی کتاب میں یہ دوسری بات اچھی کہی ہے کہ رشدی کے قتل کا اعلان نہیں' سامان ہونا چاہیئے تھا۔ اور یہ امام خمینی کے لئے ناممکن العمل نہ تھا۔ بایں سبب ان کے فتویٰ کو خود نمائی کے پلڑے میں رکھا جا سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر اپنی روح کے اعتبار سے تو امام آیت اللہ خمینی کا فتویٰ قتل درست' اگرچہ طریقِ کار کے لحاظ سے غلط تھا۔ دینی فریضہ کی تکمیل پر انعام کا اعلان بجائے خود غیر مستحسن ہوتا لیکن اس پر مستزاد ایرانی اور غیر ایرانی کی تفریق ہے۔

حسنِ اتفاق سے محترمہ بے نظیر بھٹو کے منقولہ مؤقف میں معقولیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر اس بات کی امید ہو کہ حاکم، حکمِ شریعت کو نافذ کرے گا تو ضرور بات کو آگے پہنچانا چاہیے لیکن ایسا ممکن دکھائی نہ دے تو پھر اگر کسی نے آقائے نامدار (ﷺ) کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ کہہ دیا ہے تو اسے پھیلانا اور بار بار دہرانا درست نہیں۔ قصہ کوتاہ اس امر کی کوئی گنجائش نہیں کہ بغیر کسی شرعی غرض کے اسے زبان پر لانا یا دہرانا جائز خیال کیا جائے۔ حارث بن اسد محاسبی (انہوں نے معتزلہ اور دیگر باطل فرقوں کے رد میں بہت زیادہ لکھا) پر امام احمدؒ بن حنبل نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ہمیں فرقہ ہائے باطلہ کے خیالات کا اپنی کتاب و رسائل میں ذکر نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ اس طرح ان کے ناپاک افکار و نظریات ہمارے ذریعہ امت تک پہنچ جاتے ہیں۔

موصوف نے بعض ایسے سوال بھی اٹھائے ہیں جو بجائے خود جواب ہیں۔ کئی مواقع پر انکار کے پردے میں ان سے اقرار ہو گیا ہے۔ کہیں وہ تردید کرنا چاہتے ہیں مگر تائید ہو گئی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

○ "ملک کا اقتدار اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے یہ امید نہ ہو کہ وہ مجرم کے اوپر شرعی سزا کا نفاذ کریں گے، تب بھی مسلمانوں کے لئے قانون اپنے ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے لئے نصیحت اور صبر ہے نہ کہ سزا کا نفاذ۔ یہ اصول مکی دور کے عمل سے ثابت ہے۔ اس وقت مکہ کے لوگ کھلے طور پر شراب پیتے تھے مگر رسول اللہ (ﷺ) یا آپ ﷺ کے اصحاب نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا"۔

○ "توہینِ رسولؐ (شتمِ رسولؐ) پر فقہاء نے جو سزا مقرر کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب بھی کسی کو محسوس ہو کہ فلاں شخص نے پیغمبر کی توہین کی ہے تو وہ فوراً بندوق ہاتھ میں لے اور وہاں پہنچ کر اسے گولی مار دے۔ اسلام میں جرم کا معاملہ ایک عدالتی معاملہ ہے۔ یعنی مجرم کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا اور عدالتی کارروائی کے بعد اس پر ضروری فیصلہ کا نفاذ کیا جائے گا۔ عدالتی کارروائی کے بغیر اگر کوئی شخص کسی مجرم کو سزا دینے لگے تو یہ ایک سرکش کا فعل ہے نہ کہ اسلام کا فعل"۔

○ "اب اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب سے ہمارے جذبات مجروح ہوئے ہیں، اور ہم تو اس کو قتل کر کے رہیں گے، تو میں کہوں گا کہ "مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا" اسلام کے قانون جرائم کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔ مسلمان اگر اس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام کے نام پر اس قسم کا فعل کریں تو انہیں ڈرنا چاہئے کہ ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش میں وہ اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بڑا مجرم نہ بنا لیں"۔

○ "واقعہ یہ ہے کہ سبّ و شتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام (ﷺ) پر ایک اعتراض ہے اور جو شخص اسلام اور پیغمبرِ اسلام (ﷺ) پر اعتراض کرے، اس کی زیادہ بڑی سزا یہ ہے کہ اس کی بات کو دلیل کے ذریعے رد کر دیا جائے۔ اس کو گولی مارنا اگر اس کا جسمانی قتل ہے تو اس کے اعتراض کو رد کرنا اس کا ذہنی قتل۔ اور جسمانی قتل کے مقابلہ میں ذہنی قتل بلاشبہ زیادہ سخت ہے، اور زیادہ کارگر بھی"۔

○ "امام ابو یوسف نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ (ﷺ) کھانے میں کدّو کو پسند کرتے تھے اور اس کو رغبت سے کھاتے تھے۔ اس پر جماعت میں سے ایک شخص اٹھا اور اونچی آواز سے کہنے لگا کہ مجھے تو کدو پسند نہیں۔ امام ابو یوسف نے اس کے اس کلام کو شتم قرار دیا اور اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ آخرِ کار اس شخص نے توبہ کی اور (حنفی مسلک کے مطابق) اس کی معافی ہوئی"۔

○ "حقیقت یہ ہے کہ ارتداد اور شتم کو ہم معنٰی قرار دینا بذات خود ایک غلط قیاس ہے۔ ارتداد ایک شخصی فعل ہے جس طرح قاتل کا قتل کرنا ایک شخصی فعل ہے۔ مرتد صرف یہ کرتا ہے کہ اپنی ذات کو دین سے الگ کر لیتا ہے۔ مگر شتم ایک متعدی فعل ہے۔ کیونکہ شاتم اپنے شتم کے ذریعہ لوگوں پر اثر ڈالتا ہے۔ وہ دوسروں کے اندر دین کے بارہ میں شک ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شتم، اعتراض اور تنقید اور نکتہ چینی کی نوعیت کا فعل ہے۔ مرتد کو ذاتی سزا دے کر اس کا مسئلہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ مگر شتم کے اثرات کو اس وقت تک ختم کرنا ناممکن نہیں جب تک اس کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دلیل کے ذریعہ رد نہ کر دیا جائے"۔

○ "مرتدین کا مقابلہ تلوار کے ذریعے یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا جواب زیادہ طاقتور الفاظ سے دیا جائے جیسا کہ حسّان بن ثابت انصاریؓ نے کیا اور کامیاب ہوئے۔ اس

مثال سے مرتد اور شاتم کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے"۔

○ "جن لوگوں کی نظر فقہ کی کتابوں پر ہے' وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل میں فقہا زیادہ تر صرف رائے نقل کرتے ہیں' وہ اس کے دلائل بیان نہیں کرتے۔ ان مسائل میں فقہاء کا عام طریقہ یہ ہے کہ ابتداء اگر ایک معروف عالم کسی مقابلہ میں ایک فتویٰ دے دے' تو بعد کے لوگ کسی مزید تحقیق کے بغیر اسی کو نقل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ دعویٰ کر دیا جاتا ہے کہ اس پر فقہاء و علما کا اجماع ہے۔ حالانکہ یہ زیادہ تر مقلدانہ اتفاق رائے ہوتا ہے نہ کہ حقیقتہً "علمی اور شرعی تعریف کے مطابق اجماع"۔

○ "اجماع کو متفقہ طور پر چار ادلّہ شرعیہ میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ تاہم قتل شاتم کے بارہ میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس پر علماءِ امت کا اجماع ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کہا جائے کہ جمہور علماء نے اسی رائے پر اظہار کیا ہے"۔

○ "رسول اللہ (ﷺ) کے زمانہ میں بہت سے کافروں اور مشرکوں اور منافقوں نے آپ ﷺ کے خلاف بدترین قسم کے جرائم کیے۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ (ﷺ) یہ الفاظ بولیں کہ فلاں شخص کو قتل کر کے اس کو جہنم رسید کرو۔ ایسے الفاظ بولنا گویا اپنے آپ کو خدا کی سیٹ پر بٹھانا ہے"۔

○ "رشدی نے "شیطانی آیات" لکھ کر خود اپنے آپ کو بدنام کیا تھا' مگر مسلمان اپنی ان حرکتوں سے خود پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کو بدنام کر رہے ہیں۔ اب ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ بڑا مجرم ہے؟"۔

○ "ایک گستاخِ رسولؐ کو سزا دینے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کو بہانہ بنا کر اسلام کی دعوتی تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے' تو ایسی حالت میں اسلام کی دعوت تصویر کی حفاظت کو ترجیح دی جائے گی اور گستاخ رسولؐ کی سزا کے معاملہ کو اللہ

کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوت ہے اور دعوت کا مفاد ہے۔ بقیہ چیزوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے"۔

○ "غزوۂ تبوک کی واپسی میں کچھ منافق قسم کے مسلمان آپ (ﷺ) کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ مخلص مسلمانوں سے الگ ہو کر بیٹھتے اور رسول اللہ (ﷺ) کے خلاف بے ہودہ باتیں کیا کرتے۔ حضرت حُذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ (ﷺ) نے رات کے وقت کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ جانتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسول ﷺ کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے کہ ہم انہیں قتل کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ناپسند ہے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں"۔

○ "اٹلی کے دانتے (۱۳۲۱-۱۲۶۵ء) نے ڈیوائن کمیڈی میں' نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ' نقل کفر کفر نباشد' نبی پاک (ﷺ) کو جہنم میں دکھایا ہے۔ ترکی کی عثمانی سلطنت کا بانی سلطان عثمان غازی (۱۲۵۸-۱۳۲۶) دانتے کا ہم عصر تھا۔ مگر اس نے یہ فرمان جاری نہیں کیا کہ جو شخص دانتے کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو اتنا سنہری سکہ انعام دیا جائے گا۔ شیکسپیئر (۱۶۱۶-۱۵۶۴) نے اپنے ڈرامے میں پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ جھوٹا رسول بتایا ہے۔ شاہ جہاں (۱۶۶۶-۱۵۹۲) شیکسپیئر کا معاصر تھا مگر ہندوستان کے علماء نے شاہ جہاں سے یہ نہیں کہا کہ فوراً ایک یا زیادہ آدمی کو ہتھیار دے کر انگلینڈ بھیجو تاکہ وہ وہاں پہنچ کر شیکسپیئر کو قتل کر دیں' وغیرہ وغیرہ!"

○ "مزید یہ کہ تاریخ میں بہت سے سچے اور بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جن کو وقت کے ظالموں نے قتل کیا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ

مقتول کا رشتہ ان گزرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ پیش آیا ہے جو اس سے پہلے بے شمار' سچے انسانوں کے ساتھ پیش آیا۔ اس طرح مخالفین کے ہاتھوں سے قتل ہونا اس کو "شہیدانِ حق" کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔ یہ کوئی فرضی بات نہیں۔ سلمان رُشدی کے اعلان قتل کے بعد عملاً" یہی بات پیش آئی ہے۔ مثال کے طور پر ٹائمز آف انڈیا (۵۔ مارچ ۱۹۸۹) میں ایک مضمون نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے' "(Consored by Religion)"۔ اس مضمون میں سلمان رشدی کو تاریخ کے ان بڑے بڑے لوگوں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے جن کو ان مخالفین نے قتل کر دیا' یا جن کو مکہ کے لوگوں نے قتل کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سقراط' مسیح' گلیلیو' مارٹن لوتھر وغیرہ۔ حتیٰ کہ پیغمبرِ اسلام (ﷺ)' جن کو مکہ کے لوگوں نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مشہور سائنس دان گلیلیو کے انجام کا تذکرہ کرتے ہوئے اس مضمون میں یہ الفاظ درج کیے گئے ہیں کہ گلیلیو کو اپنی آخر عمر تک اپنے گھر کے اندر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی مقدر رشدی کا آج ایک نئی صورت میں ہو سکتا ہے"۔

○ "سوامی شردھانند ہندوستان میں شُدّھی تحریک کے بانی تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "رنگیلا رسول" تھا۔ برِصغیر ہند کے مسلمانوں نے اس کتاب کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ کتاب پیغمبرِ اسلام کی "شانِ عظمت کے خلاف توہین آمیز تھی"۔ آخر کار یہ واقعہ پیش آیا کہ دسمبر ۱۹۲۶ کی آخری تاریخوں میں ایک مُسلم نوجوان نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا۔ اس نوجوان کا نام عبدالرشید تھا۔ اس کی بیوہ ماں نے اکلوتے بیٹے کو خوشی خوشی اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ ناموسِ رسول (ﷺ) کی حفاظت کے لیئے قربان ہو جائے۔

لیکن اگر ناموس رسول (ﷺ) کی حفاظت کا طریقہ یہی ہو تو یقیناً یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ اس قتل کے بعد شردھانند نے اس ملک کی اکثریت کے درمیان قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر لی"۔

مرقومہ بالا اقتباسات و تأثرات میں ظاہراً" بڑی دردمندی کے ساتھ تاریخی حقائق اور انسانی نفسیات کی اثر انگیزیاں ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ بالعموم زندہ حقیقتوں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے' اور کئی ایک واقعاتی غلطیاں بھی اس حصہ میں شامل ہو گئی ہیں۔ سوامی شردھانند شُدّھی تحریک کا بانی تو تھا لیکن "رنگیلا رسول" مذکور نے نہیں لکھی تھی' بلکہ اسے لاہور کا ایک ہندو پبلشر مہاشہ راجپال منظرِ عام پر لایا اور غازی علم الدین شہیدؒ کے ہاتھوں ۱۹۲۹ میں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ الغرض شردھانند کے قتل سے بالیقین حقیقی مقصد حاصل ہو گیا تھا۔

مصنف مذکور کہتے ہیں کہ ہلاکت سے دوچار ہو کر رشدی بھی تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کی فہرست میں گنا جائے گا' لہٰذا اسے زندہ رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔ راقم الحروف نے تاریخ کی سرگزشت سے اس کے بالکل برعکس نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب سچائی کے پرستار موت سے گلے ملتے ہیں تو سچ مزید پھلتا پھولتا ہے لیکن باطل کے نمائندے فنا کے گھاٹ اترتے ہیں تو جھوٹ بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو جایا کرتا ہے۔ اگر دشتِ کربلا میں حسینؓ مارا جائے تو صدیاں اداس ہو جاتی ہیں' لیکن جب قاتلانِ حسینؓ کے سر کٹے تو چشمِ فطرت بھی مسکرا دی تھی۔ آج تک کسی غدّار کا مزار بنتے نہیں دیکھا گیا۔ سجاح اور مُسیلمہ کذّاب وغیرہم بھی اسلام کی تلوار سے قتل کیے گئے تھے۔ آئے دن نامی گرامی ڈاکو لٹکا دیئے جاتے ہیں اور ان کی مَحبّت کا دم بھرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ پھر ہم یہ کیسے کہ سکتے ہیں کہ اس طرح مجرم بھی ہیرو قرار پا جاتے ہیں۔ ارسطو اور گیلیلیو کو اگر موت بھی مار نہ سکی تو یہ سچائی کی رعنائی

تھی۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ جب تک ابو جہل زندہ رہا، فتح مکہ کے اسباب پیدا نہ ہو سکے تھے۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت کا کام حضرت ابو بکر صدیقؓ نے تمام کر دیا تو آج ان کا کوئی نشان بھی باقی نہیں ملتا۔ لیکن ذکری فرقہ کے بانی کو برداشت کیا گیا اور مرزا غلام احمد قادیانی کو تلوار کا شکار نہیں بنایا گیا تو ایک بہت بڑا فتنہ سر اٹھائے کھڑا ہے اور ہزاروں افراد اپنا دین و ایمان گنوا بیٹھے ہیں۔

دانتے کے بارے میں اگر سلطان عثمان غازی نے کوئی فرمان جاری نہیں کیا تھا اور شیکسپئیر سے متعلق عہد شاہ جہاں میں اگر سزائے قتل کی تحریک نہیں اٹھی تو اس کا یہ مطلب کب ٹھہرا کہ اسلام میں گستاخِ رسولؐ کے لیئے موت کی سزا نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس دور میں ذرائع مواصلات معدوم تھے۔ الیکٹرانک میڈیا بھی موجود نہ تھا اور آمد و رفت ایک طرح سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ تب شاید اس امر کی خبر تک نہ ہو سکی ہو۔ لیکن اب پوری دنیا گلوبل ولیج ہے۔ فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ فی الحقیقت یہ کوئی شرعی، فقہی، تاریخی یا عقلی دلیل نہیں بنتی۔

موصوف، اجماع کی بھی غلط تعریف فرما گئے ہیں۔ فقہاء و علماء کے اتفاقِ رائے سے مراد یہ ہے کہ کسی دور میں ایک مسئلہ سامنے آتا ہے اور قرآن و سنت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں ان میں سے ایک یا بعض کا نقطۂ نگاہ نشر ہوتا ہے لیکن دوسرے حضرات اس کی تحریر و تقریر کے ذریعہ یا خاموش رہ کر تائید کر دیتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی رائے نہیں پائی جاتی تو یہ اجماع متصوّر ہو گا۔ شتمِ رسول (ﷺ) پر سزائے موت کے بارے میں اجماعِ امت کی یہ کیفیت ہے کہ پوری تاریخِ اسلام میں ماسوائے عہدِ حاضر کے بعض نام نہاد مسلمانوں کے، ہم کسی ایک مسلمان کو بھی نہیں جانتے جو اس کا قائل نہ ہو۔

مرتدین و شاتمین کا معاملہ ایک دوسرے سے واقعی مختلف ہے۔ لیکن یہ

مُوقف صحیح نہیں کہ سبّ و شتم کرنے والوں کا مقابلہ زیادہ طاقتور الفاظ سے کیا جائے۔ حق یہ ہے کہ شتم، ارتداد سے بھی زیادہ سخت جرم ہے اور اس پر سزا بھی سخت ترین ہے۔ نیز یہ کہ سبّ و شتم، اعتراض، تنقید اور نکتہ چینی کی نوعیت کا فعل نہیں ہے، بلکہ بدامنی پھیلانے، فتنہ پیدا کرنے اور دشمنی و غارت گری سے بھی بدتر نوعیت کا فعل ہے۔ ارتداد ایک انفرادی جرم ہے جبکہ شتم، اجتماعی ظلم، یہی سبب ہے کہ مرتد کو توبہ کا موقع فراہم کیا جاتا ہے لیکن شاتم سے یہ رعایت بھی نہیں برتی جا سکتی۔

امام ابُو یوُسُف نے اس شخص کے بارے میں جس نے رسول اللہ (ﷺ) کی کدّو سے رغبت کا بیان سن کر سرِ عام ناپسندیدگی کا اظہار کیا، قتل کا فتویٰ صادر نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ اگر اس نے توبہ نہ کی تو میں اس کے قتل کا حکم دے دوں گا۔ اس میں ایک انتہائی باریک نکتہ پنہاں ہے۔ اس کی وضاحت دوسرے مقام پر زیرِ بحث لائی جائے گی۔

یہ بھی درست ہے کہ اسلام میں جرم کا معاملہ ایک عدالتی معاملہ ہے۔ مگر تاریخ و فقہ میں بعض استثنائی نظائر بھی مذکور ہیں نیز ان صورتوں میں صرف ذہنی قتل پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ جسمانی قتل مقصود و ناگزیر ہوتا ہے۔

غزوۂ تبوک سے واپسی پر نبیٔ کریم رؤف الرحیم (ﷺ) کا یہ فرمانا کہ مجھے ناپسند ہے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں، محض ایک مصلحت کے تحت تھا۔ اس حدیثِ مبارکہ سے بھی یہ قطعاً" عیاں نہیں ہوتا کہ یہ لوگ واجب القتل نہیں ہیں۔ بلکہ بین السطور یہی مفہوم جھلکتا ہے کہ ان کے مباح الدّم ہونے میں تو کوئی کلام نہیں مگر فی الحال حکمتِ دین کا تقاضا اس سے مختلف ہے۔ سرکارِ اقدس (ﷺ) اس سلسلے میں با اختیار تھے لیکن ہم پابند ہیں۔ واضح رہے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ منافقین کے حوالہ سے ارشاد فرمائے

تھے جو بظاہر اپنے تئیں مسلمان جتلاتے تھے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے نفاق و اہانت کا کوئی شرعی ثبوت مہیا نہ تھا۔ چونکہ نفاق ایک پوشیدہ اور باطنی معاملہ ہے۔ اور بظاہر تو وہ اسلام کے دوست ہی سمجھے جاتے تھے۔ عوام الناس ان کو دینِ اسلام کے اعوان و انصار اور حضور رحمت للعالمین (ﷺ) کے اصحاب میں شمار کرتے تھے۔ اگر رسولِ کریم (ﷺ) ایسی صورت میں ان کے پوشیدہ امور اور نفاق کی وجہ سے اس علم کی بناء پر جو آپ ﷺ کو ان کے قلبی خیالات سے متعلق حاصل تھا، انہیں قتل کر دیتے تو لازماً" دشمنانِ اسلام کو موقع مل جاتا اور ان کے منہ میں جو آتا بکتے، جاہل لوگ شبہ میں پڑ سکتے تھے۔ شیطان جھوٹی باتیں بناتا اور یوں بہت سے قبائل و افراد قبول دین سے رک جاتے کہ شاید آپ ﷺ نے ساتھیوں کو کسی پرانی یا خفیہ عداوت کی وجہ سے قتل کرایا یا شاید کوئی بدلہ لیا ہے۔ حضرت امام مالکؒ یہی مؤقف رکھتے ہیں۔

آپ ﷺ اگر محض علمِ نبوت کی بناء پر بغیر کسی ظاہری ثبوت اور شرعی شہادتوں کے، ان پر حد جاری فرماتے تو یہ آپ ﷺ کی سنت سے دور تھا۔ آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ امت کے لئے حجت ہے۔ لہٰذا یوں آگے چل کر غلط روایت پڑنے اور الجھنیں پیدا ہونے کا امکان تھا، جسے رسولِ خدا (ﷺ) پسند نہ فرما سکتے تھے۔ محمد بن مواز کا قول ہے کہ اگر منافقین کا یہ طرز عمل ظاہر ہوتا تو سالارِ بدر و حنین (ﷺ) انہیں ضرور قتل کرا دیتے۔ قاضی ابو الحسن قصار نے بھی یہی فرمایا ہے۔ پیارے آقا و مولا (ﷺ) ان میں بعض کے بارے میں یہ علم بھی رکھتے تھے کہ کن کی قسمت یاور کرے گی اور وہ آگے چل کر کب مشرف بہ اسلام ہوں گے۔ مستقبل میں دینِ متین کے حامی ٹھہرنے والوں کی نسبت بھی نرم رویّہ اختیار فرماتے تھے اور یہ آپ کا اعجازِ علم ہے، جو کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا کوئی دوسرا یہ رعایت برتنے کا بھی مجاز نہیں ہے۔

اسی پس منظر میں رسولِ پاک (ﷺ) نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ لوگ کہتے پھریں کہ محمد (ﷺ) اپنے اصحاب کو قتل کرتے رہیں۔ نیز فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن کے قتل سے اللہ تعالیٰ نے مجھے منع فرمایا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مخصوص لوگوں کے قتل کا عارضی طور پر امتناع اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول (ﷺ) کے نزدیک مباح الدم نہ تھے۔ بلکہ عملاً" یہ ایک اثباتی حکم ہے اور ان کے واجب القتل ہونے پر دلیل بھی۔ جیسا کہ صلحِ حُدیبیہ میں ظاہراً" مومنین کا دب جانا، باطناً" فتح مبین کا ذریعہ ٹھہر گیا تھا۔ اسی طرح از رُوئے حکمتِ خداوندی ان کے اس طرزِ نفاق پر فی الحال اعراض برتنا مفید تھا۔

آخرش اس باب میں مولانا وحید الدین خان کی طرف سے اٹھائی گئی چند دیگر غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ناگزیر ہے۔ رُشدی کو کسی نے بھی اس وجہ سے واجب القتل نہیں ٹھہرایا کہ اس نے "مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ بلکہ وہ اس سبب سے قابلِ گردن زنی ٹھہرایا گیا ہے کہ اس نے صاحب التاج والمعراج (ﷺ) کی توہین کا ارتکاب کیا جو کہ اسلام میں ناقابل معافی ہے اور اس سے مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح ہوئے ہیں۔ مولانا مذکور کا یہ مؤقف بڑی حد تک صحیح ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا پسند نہیں فرمایا۔ مگر اس میں بعض مستثنیات ہیں، جن کا بیان دوسرے باب میں آئے گا۔ ان کا یہ نقطۂ نظر بڑا عامیانہ اور غیر منطقیانہ ہے کہ سبّ و شتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام (ﷺ) پر اعتراض ہے اور اعتراض کو دلیل سے ہی رد کیا جانا چاہئے۔ فی حقیقت اعتراض اور چیز ہے جبکہ لعن طعن دوسری چیز۔ سچ یہ ہے کہ "مولانا" وحید

الدین خاں اسلامی فکر و نظر کو مطلقاً" نہیں سمجھ پائے اور انہوں نے رسالہ میں رطب و یابس کا انبار لگانے کے علاوہ کوئی مفید اور سنجیدگی کا کام نہیں کیا ہے۔

حکمت و استدلال

○ شاتم الرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ذلت ناک موت سے دوچار کرنا سنتِ الٰہیہ، رضائے آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، عملِ صحابہؓ و تابعین اور فقہ و تاریخ سے ثابت ہے۔ خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اس کا مقدر بہرحال موت ہے۔

○ اگر کوئی بدبخت و نام نہاد مسلمان حضورِ مکرم شفیع معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شانِ اقدس میں نعوذ باللہ "گستاخی و بے حیائی کا مرتکب ہو تو اس کا یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی سزا قتل اور صرف قتل ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی مسلمان ویسے مرتد ہو جائے تو اسے توبہ کا موقع دیا جانا روا ہے۔ بلکہ لازم ہے لیکن سب و شتم سے جو ارتداد پیدا ہوتا ہے، اس میں اگرچہ وہ توبہ ہی کرے، اس کی سزائے قتل ساقط نہ ہو گی۔

○ حقیقت حال یہ ہے کہ توبہ کی قبولیت یا عدمِ قبولیت کا تعلق، عند اللہ ہے۔ یہ ایک بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا رشتہ عذر و معافی سے منسلک ہوتا ہے۔ اور یہ جرم اس نوعیت کا ہے کہ کوئی بھی شخص معذرت خواہی تسلیم کر لینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذاتی حق تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسے معاف فرما سکتے تھے۔ لیکن کسی امتی کو ہرگز یہ استحقاق حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی ایسے مجرم سے توبہ کا صدور ہوا اور اس کا عمل بھی گواہی دے تو فقہاء کہتے ہیں کہ اس کی تکفین و تدفین اسلامی طریق پر ہو گی اور تقسیم وراثت کے لیئے

بھی قانونِ اسلامی حرکت میں آئے گا۔ اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کی نیت سے متعلق نیک گمان رکھیں۔ مگر اس سے شرعی حد کسی صورت ساقط نہیں ہو سکتی۔

○ انفرادی اور اجتماعی ارتداد کی نوعیت میں بھی فرق ہے۔ فقہاء مرتد کی ذاتی حیثیت اور معاشرتی اہمیت کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ اس میں دیکھا جاتا ہے کہ اس کے مرتد ہو جانے سے دیگر لوگوں پر کیا اثرات مرتسم ہوئے۔ اگر اس کے دین سے پھر جانے کی وجہ سے پورا معاشرہ یا کوئی خاص علاقہ متاثر ہوا تو توبہ کا تسلیم کیا جانا یا نہ کیا جانا موقع محل کی مطابقت سے خلیفہ وقت اور قاضی پر منحصر ہے لیکن گستاخِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے باب میں عدلیہ کو بھی رعایت دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

○ ارتداد کی صورت میں عموماً" توبہ و عذر کا ایک موقع لازمی طور پر مل جاتا ہے، لیکن شتمِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مرتکب کے لیئے اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سبّ النبی کے مجرم کے لیئے توبہ و معافی کا دروازہ ہمیشہ کے لیئے بند ہے۔ بعض فقہاء نے تو گستاخِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توبہ کو عند اللہ بھی ناقابلِ قبول قرار دیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ نیتوں سے متعلق ہے اور ایک بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے۔ اس پر کوئی فتویٰ یا حتمی حکم نہیں دیا جانا چاہیئے۔

○ عام مرتد کی توبہ قبول کر لینے کی نظائر سنتِ رسولِ مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عہدِ صحابہؓ میں موجود ہیں۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں مانعینِ زکوٰۃ و منکرینِ ختمِ نبوت (مرتدین) کی توبہ و معافی کو تسلیم کر لیا گیا لیکن خاص مرتد (گستاخِ رسول) کو معاف نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب قاضی کوفہ تھے تو انہوں نے دیگر مرتدین کے برعکس ایک شخص عبداللہ ابن نواحہ کو اس کی توبہ کے باوجود سزائے موت دی تھی اور فرمایا کہ یہ گستاخیٔ رسول

(ﷺ) کا مرتکب ہو چکا ہے۔

○ یہ امر مسلمہ ہے کہ اگر کوئی نام نہاد مسلمان بے ادبی و گستاخی کا مرتکب ہو تو اس کے لئے سزائے موت سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں، چونکہ وہ اسلام کے ساتھ اپنے ماضی کے تعلق کی وجہ سے اس جرم کی شدت سے کماحقہ آگاہ تھا۔ راقم الحروف کا اس بارے میں ذاتی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ایک غیر مسلم کے لئے جب وہ ایک آزاد غیر مسلم ریاست کا شہری ہے، اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ از خود تائب ہو کر آ جائے یا اپنے آپ کو اسلامی ریاست کی تحویل میں دے دے اور مع ثبوت بتائے کہ میں گمراہ تھا۔ اب حقیقت حال کھل چکی ہے اور میں خلوص نیت کے ساتھ اسلام قبول کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر یوں اس کے قبول اسلام کی صداقت ظاہر ہو جائے تو شاید اسے معاف کیے جانے کی کوئی گنجائش موجود ہو۔

○ بعض فقہا فرما گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں بے ادبی و گستاخی کرنے والے کی توبہ و معافی کو قبول کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس قسم کی کسی جسارت سے متأثر نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ لیکن اس کے برخلاف رسول اللہ (ﷺ) عظمتِ بشر ہیں۔ ان کی ذات اس سے مستثنیٰ نہیں اور یہ کہ آپ (ﷺ) سے بدگمانی اور سبّ و شتم قبول حق کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور بدامنی و فتنہ پروری کا ایک خطرناک ذریعہ ہے۔ لہٰذا اہانتِ رسول (ﷺ) کے مرتکبین کو بہر طور موت کے گھاٹ ہی اتارا جائے گا۔

○ سبّ اور شتم کا مفہوم کیا ہے؟ اور اس کی کیا تعریف معیّن کی جا سکتی ہے؟ اس کے لئے ہمیں عُرف سے رجوع کرنا چاہئے۔ اہل عرف کے نزدیک جو چیز (کلمہ، اشارہ حرکت وغیرہم) گستاخی اور عیب شمار ہو گی، انہیں "سبّ و شتم" کہا جائے گا۔

اس باب میں قاضی ابو الفضل عیاض اندلسیؒ (صاحب الشفاء) فرما گئے ہیں:

جان لو کہ جو شخص سرکارِ مدینہ (ﷺ) کو گالی دے، یا آپ پر عیب لگائے، یا کسی نقص کی نسبت آپ کی ذات، نسب، دین یا آپ کی عادات میں سے کسی عادت کی طرف کرے یا آپ ﷺ کو بطریقِ گستاخی کسی چیز سے تشبیہ دے یا آپ ﷺ کو ناقص کہے یا آپ ﷺ کی شان کو کم کرے یا آپ ﷺ پر یا آپ ﷺ کی کسی بات پر عیب لگائے تو گویا وہ سابّ النبی (نبی کو گالی دینے والا) ہے۔ اس کے بارے میں وہی حکم ہے جو آپ ﷺ کو گالی دینے والا کا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا"۔

○ بعض لوگ یہ مَوقف اختیار کرتے اور کہتے ہیں کہ عہدِ رسالت مآبؐ (ﷺ) اور دورِ صحابہ میں مطلق گستاخیٔ رسالت کی وجہ سے کسی کو قتل نہیں کیا گیا، بلکہ نقضِ عہد کی بناء پر ان کی گردن ماری گئی تھی۔ حالانکہ یہ مکمل طور پر دھاندلی ہے کیونکہ عملِ صحابہؓ سے اس کی کئی نظائر میسر ہیں اور بیان میں آ چکی ہیں جبکہ رسولِ پاک (ﷺ) نے جیسا کہ احادیثِ مبارکہ سے بھی ثابت ہے، متعدد بار حکم دیا کہ کون ہے جو میرے فلاں دشمن کی خبر لے گا، کیونکہ وہ مجھے اذیت دینے والا ہے۔ مزید بر آں یہ کہ اگر کسی کو قصاص وغیرہ میں قتل کیا جاتا تو پھر باقاعدہ شہادتیں طلب ہوتیں اور ان کو صفائی وغیرہ کا موقع فراہم کیا جاتا۔

○ فتحِ مکہ کے دن ابنِ خطل کے علاوہ دو لونڈیوں کو بھی ہلاکت سے دوچار کیا گیا تھا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ حضورِ پاک (ﷺ) کی شان میں اہانت آمیز کلمات کہا کرتی تھیں۔ اگر ان میں سے کسی کا جرم ارتداد ہوتا تو ان کو حسبِ دستور توبہ کا موقع ملنا چاہئے تھا، جیسا کہ مطلق ارتداد میں دیا جاتا ہے۔ اگر انہیں قصاص میں مارا جا رہا تھا تو مقتول کے ورثاء کو طلب کیا جاتا تاکہ چاہیں تو معاف کر دیں، نہیں تو قتل کر دیا جائے۔

بناء بریں کعب بن اشرف وغیرہم کے قتل کو بھی نقضِ عہد کا سبب گردانا مطلق لاعلمی

اور جہالت ہے۔ کیونکہ' اس کے ثبوت میں کتبِ تواریخ اور احادیث موجود ہیں کہ اسے حضور (ﷺ) کی ہجو اور آپ ﷺ کو گالیاں دینے کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا۔

○ کتبِ احادیث و تواریخ سے ظاہر ہے اور ان کی تائید قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی ایک آیۂ مبارکہ سے ہوتی ہے کہ اہانتِ رسول (ﷺ) کی پاداش میں معاہد کو بھی قتل کر سکتے ہیں' کیونکہ آپ ﷺ کی توہین سے ان کا عہد ٹوٹ جاتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ عہدِ رسالت (ﷺ) کی نظائر شاہد ہیں کہ شاتمِ رسولؐ کو دھوکے سے قتل کیا گیا' اور یہ کہ متعدد گستاخانِ رسول کو صحابۂ کرامؓ نے رسولِ اکرم (ﷺ) سے اجازت لئے بغیر ہی فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ محبوبِ خدا (ﷺ) نے اس پر تحسین و آفرین فرمائی۔ ان کے ورثاء میں سے کسی کے بھی مطالبۂ قصاص کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

○ تاریخ گواہ ہے کہ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا رویّہ و سلوک اہلِ کفر و باطل کے لئے کس قدر سخت تھا۔ خفیف گستاخی پر انہوں نے ایک بشر نامی منافق کی گردن اڑا دی تھی۔ شاتم الرسولؐ سے متعلق ان کا نقطۂ نظر اور عمل ایک روشن حوالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن مطلق مرتد کے بارے میں ان سے متعلق یہ روایت بطورِ خاص قابل ذکر ہے: "محمد بن عبداللہ بن عبدالقاری سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایک آدمی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی جانب سے آیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے اس بارے میں بتایا۔ پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا' کوئی عجیب واقعہ تو پیش نہیں آیا۔ اس نے کہا کہ پیش آیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا' تو تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا کہ ہم نے اس کی گردن اڑا دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم

نے اسے تین دن کے لئے قید و بند میں کیوں نہ رکھا کہ ہر روز اسے روٹی کھلاتے اور توبہ کا مطالبہ کرتے رہتے۔ ممکن تھا' وہ توبہ کر لیتا اور اللہ کے دین کی طرف لوٹ آتا۔ پھر فرمایا: "اے اللہ! میں اس وقت حاضر نہ تھا اور نہ ہی میں نے اس بات کا حکم دیا اور نہ ہی اسے سن کر راضی ہوا"۔

○ ہر جرم کی سزا کے لئے ایک قانونی طریق کار مقرر ہے۔ اس کا فیصلہ عدالت کرتی اور حکومت و ریاست عمل درآمد کو یقینی بناتی ہے۔ دینِ فطرت میں شتم رسول پر موت کی سزا لاگو کی جاتی ہے۔ فقہی تقاضا ہے کہ گستاخِ رسول (ﷺ) کو بھی عدالت کے روبرو پیش کیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان اپنے طور پر توہینِ رسالت کے کسی مرتکب کو لقمۂ اجل بنا دے تو از رُوئے اسلام اس پر کوئی بار نہ ہو گا۔ کیونکہ اپنے آقا و مولا (ﷺ) کی شان میں بے ادبی پر مشتعل ہو کر انتہائی اقدام اٹھانا ایک فطری امر ہے اور غیرتِ ایمانی پر دلالت کرتا ہے۔ اس مؤقف کی تائید میں زمانۂ نبوت کی متعدد نظائر اور تاریخی شواہد میسر ہیں۔ اس سلسلے میں شرط صرف یہ ہے کہ قاتل کوئی ذاتی و دنیوی وجہ عناد نہ رکھتا ہو اور یہ کہ بعض صورتوں میں جرم ثابت بھی کیا جا سکے۔

○ اسلامی مزاج کے مطابق اللہ تعالیٰ کے کسی بھی پیغمبر (علیہ السلام) کا شاتم واجب القتل ہے اور اسلامی ریاست اس قانون کے نفاذ کی پابند ہے۔ اس باب میں کسی مسلم یا غیر مسلم کا امتیاز روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر اس سلسلے میں حکومت کسی بھی وجہ سے صرف نظر کرتی ہے تو وہ خداوندِ کریم کی مغضوب و معتوب ٹھہرے گی' کیونکہ اس نے ایک اہم فریضہ سے پہلو تہی کی' اس لئے کہ یہ اسلام کے قانون کا اساسی ستون ہے۔

○ اگر کسی پیغمبرِ خداؐ کی توہین کا ارتکاب اسلامی مملکت کی حدود سے باہر کیا گیا ہو تو اس صورت میں مسلم حکومت مجرم کو قرار واقعی سزا تک پہنچانے کی مکلّف نہیں ٹھہرتی۔

اس کے لیئے بین الاقوامی قوانین کی رعایت سے یا اخلاقی بنیادوں پر مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتے ہیں اور یہ کہ حالات و واقعات کے مطابق کوئی بھی مؤثر قدم اٹھایا جائے گا۔ لیکن اگر خاص پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی شان میں اہانت کی گئی ہو تو مجرم کو کیفرِ کردار سے دوچار کرنا مسلمانانِ عالم پر من حیث القوم فرض ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فرضِ کفایہ ہے۔ اس کی ادائیگی بہرحال لازم ہے۔ یہ اہم ذمہ داری اگر کوئی انفرادی طور پر نبھاتا ہے تو ہم اجتماعی طور پر سرخرو ہو جائیں گے۔ اور بالفرض پوری ملتِ اسلامیہ میں سے اپنا حق کوئی فرد بھی ادا نہیں کرتا تو پھر تمام امتِ مسلمہ مجرم ٹھہرے گی۔

○ اگر یہ جرم غیر مسلم ریاست میں ہو گا تو ظاہر ہے کہ بذریعۂ عدالت اسلامی ضمیر کے منشا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس تناظر میں ایک ہی ممکنہ صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ کوئی غیرت مند مسلمان اندرون یا بیرون ملک سے اٹھے جو اپنے مال و جان کی پروا کیئے بغیر اس کو فنا کے گھاٹ اتار دے اور یہ طریق کار اپنی روح کے اعتبار سے عین اسلام کے مطابق متصوّر ہو گا۔

○ پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے علاوہ اگر کسی اور پیغمبر خدا (علیہ السلام) کی توہین کی جائے اور مجرم اہلِ کتاب میں سے ہو تو اس کا فیصلہ ان کی کتبِ سماویہ کے مطابق کیا جائے گا۔ بناء بریں مجرم اہلِ کتاب میں سے نہ ہو یا کوئی بدبخت مسلمان ہو تو سزا کا تعین از رُوئے قانونِ اسلام ہو گا۔ یاد رہے کہ بائبل میں نہ صرف توہینِ انبیاء کی سزا قتل ہے۔ بلکہ نائبینِ انبیاء کی گستاخی پر بھی قتل کی سزا مقرر ہے۔ استثناء آیات ۸ تا ۱۳۔ کلام مقدس، ص ۱۸۳ پر یہ واضح حکم موجود ہے: اگر تیری بستیوں میں کہیں آپس کے خون یا آپس کے دعوئی یا آپس کی مار پیٹ کی خاطر کوئی جھگڑے کی بات اٹھے اور اس کا فیصلہ کرنا تیرے لئے نہایت مشکل ہو تو اٹھ کر اس جگہ سے جسے خداوند تیرا خدا

چنے گا اور لاوی کاہنوں اور ان دونوں کے قاضیوں کے پاس پہنچ کر ان سے دریافت کرنا اور وہ تجھ کو فیصلہ کی بات بتائیں گے۔ اور اسی فیصلہ کے مطابق جو وہ تجھ کو اسی جگہ سے جسے خداوند چنے گا، بتائیں، عمل کرنا۔

شریعت کی جو بات وہ تجھ کو سکھائیں اسی کے مطابق سب کچھ احتیاط کر کے ماننا شریعت کی جو بات وہ تجھ کو سکھائیں، اسی کے مطابق عمل کرنا اور جو کچھ فتویٰ وہ دیں اس کے داہنے بائیں نہ مڑنا، اور اگر کوئی شخص گستاخی سے پیش آئے اور اس کاہن کی بات جو خداوند تیرے خدا کے حضور خدمت کے لئے کھڑا رہتا ہے یا اس قاضی کا کہنا نہ مانے تو وہ شخص مار ڈالا جائے اور تو اسرائیل میں سے ایسی برائی کو دور کر دینا“۔

○ یہ تاریخی حوالہ بھی ازحد دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے کہ مسلمانوں کو بنیاد پرستی اور تنگ نظری کا طعنہ دینے والے ہمارے مسیحی بھائی انجیلِ مقدس کی تعلیمات سے انحراف پر بھی موت کی سزا دیتے رہے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد ۱۱ ص ۴۷ میں مسطور ہے کہ جب رومن امپائر کے مقتدر اعلی جسٹینن نے مسیحیت قبول کر لی تو قانونِ موسوی کو موقوف و منسوخ کر کے بنی اسرائیل کے انبیاء کے بجائے صرف یسوع مسیح اور تعلیماتِ انجیل کی توہین پر سزائے موت مقرر کی گئی۔ ازاں بعد یہ سارے یورپ کی سلطنتوں کا قانون بن گیا اور سکاٹ لینڈ میں تو اٹھارویں صدی تک اس جرم کی پاداش میں سزائے موت ہی دی جاتی رہی ہے۔

○ گستاخِ رسول (ﷺ) کے لئے عند الناس توبہ کے دروازے مکمل طور پر بند ہیں۔ اس میں بہت سی حکمتیں مضمر اور مصلحتیں پنہاں ہیں۔ اول یہ کہ پیغمبرِ آخر الزماں (ﷺ) کی حرمت و تقدیس کے بارے تنقیص پر سزا کو بطورِ حد نافذ نہ کیا جاتا تو لادینیت اور گمراہی کو فروغ ملتا، جبکہ حد کی سزاؤں میں توبہ و معافی کی مطلقاً“ کوئی

گنجائش نہیں رکھی گئی۔ دوم یہ کہ اگر معافی یا توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جائے تو پھر بھی مجرم کو سزا مل ہی نہ پائے۔ کیونکہ وہ ارتکابِ گستاخی کے بعد جان بچانے کی خاطر فی الفور معافی کا خواستگار ہوتا اور ایک مذموم سازش کے تحت پھر اس کی جگہ کوئی اور لے لیتا۔ لہٰذا حکمتِ اسلام یہ قرار پائی کہ توہینِ نبوت پر ایسی سزا نافذ العمل ہو کہ کوئی بدفطرت و کمینہ خصلت گستاخی کی جرأت ہی نہ کرپائے۔ یہی اس سزا کا فلسفہ ہے۔

○ مسلمان، اہلِ کتاب سے یہ حق صرف لیتے ہی نہیں کہ ان کے پیارے رسول (ﷺ) کی شان میں بے حرمتی نہ کی جائے بلکہ انہیں یہ کھلا حق دیتے بھی ہیں کہ اگر کوئی بدبخت شخص، خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، ان کے انبیاءؑ کی گستاخی کا مرتکب ہو تو اسے بھی یہ سزا دی جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ مسلمان تو اپنے نظریہ و عقیدہ کی رو سے اس پر از خود کاربند اور پابند ہیں۔

○ کوئی بھی امت اگر کسی پیغمبرِ خدا کی تفضیل کا عقیدہ رکھتی ہو اور اپنے کسی مصلح یا عالم کو دوسروں پر ترجیح دیتی ہو تو یہ گستاخی کے زُمرے میں نہیں گنا جائے گا۔ یہ تو اپنے اپنے ذوق و مشرب، فکری و نظری پس منظر اور قلبی لگاؤ کی بات ہے، جس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ بلکہ سبّ و شتم سے مراد وہ اشارہ، کلمہ یا عمل ہے، جس سے طعن و تعریض یا اہانت و تنقیص کا تأثر یا گمان ابھرتا ہو۔ مطلب یہ کہ ایک کی دوسرے پر فضیلت کا نظریہ و عقیدہ اہانت نہیں ہے۔

○ میرا خیال یہ بھی ہے کہ غیر ارادی طور پر یعنی بغیر نیت کے گستاخی و بے ادبی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بدنیتی و بدباطنی اس کا اوّلین محرک ہے۔ بالغرضِ محال اگر اس کے برخلاف ہو تو محض ذہنی ارتداد و اہانت پر دینِ اسلام میں کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے۔ ذہنی ارتداد و اہانت سے میری مراد وہ طرزِ گستاخی ہے جو کوئی فرد اپنے تک ہی محدود رکھے اور بذریعہ تحریر و تقریر یا قولاً" یا فعلاً" اس کا باقاعدہ مرتکب نہ

ہو۔ سزا کا نفاذ تبھی ہو گا جب اس کا برملا اظہار کیا جائے، اور اس جسارت کا مقصد لازمی طور پر بدامنی و فتنہ پروری نیز بے راہروی و گمراہی پر منتج ہوتا ہے۔ جس کے لیئے شدید ترین سزا درکار و ناگزیر ہے۔

○ تحفظِ ناموسِ نبی (ﷺ) کے بارے میں فرزندانِ اسلام کے عقائد و نظریات، جذبات و احساسات اور انقلابی ردعمل محض جذباتی نوعیت کا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسلامیوں کے عقیدہ و ایمان کی اساس ہے۔ ان کا منفرد تشخص ہے۔ رسولِ عربی (ﷺ) کی امت کا کل اثاثہ، عرفان و ایقان کا خلاصہ، قومی امتیاز و اعزاز، بقا و وفا کا حقیقی راز، مسلسل و مستقل روایت اور ایک زندہ رواج ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمان قوم غیور و جسور اور زندہ و تابندہ ہے۔ روحِ محمد (ﷺ) جب تک اس قوم کے بدن میں موجود ہے، یہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور تختۂ دار پر بھی ہمیشہ مسکراتے رہیں گے۔ ایسے لوگ تو فنا و قضا کو بھی بقا عطا کر جاتے ہیں۔ مختصراً" یہ کہ اگر مسلمان اپنے نبی (ﷺ) کی حرمت و وقار کی تضحیک و تمسخر پر خاموشی سہار لیں تو اس کے زہریلے اثرات اور دائمی نقصانات کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔

○ حضور نبیٔ اکرم (ﷺ) کا اپنے شاتمین کو تہِ تیغ کرنا، آپ (ﷺ) کی شانِ رحمتٌ للعالمینی کے خلاف نہیں ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے اور رب العالمین بھی مگر اس نے دنیا و آخرت میں کفار و مشرکین کو معتوب ٹھہرایا اور ابدی دوزخ کا عذاب تجویز فرمایا ہے تو اگر یہ ان صفات سے متصادم نہیں تو وہ بھی نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسا معاملہ رب العالمین یا رحمت للعالمین کی صفات پر ہرگز وجہِ عیب نہیں ہے۔

○ ایک کسان کھیت میں گھسے ہوئے چند خنزیر مار ڈالے یا کوئی شخص اپنے مکان میں

در آنے والے سانپوں کو ہلاک کر دے تو اس عمل کو کسی طور پر بھی بے رحمی یا ظلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر ایک قاتل، اور ڈاکو کی موت میں لاتعداد انسانوں کی زندگی پوشیدہ ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟

○ یہ سزا غیر مسلموں کے سر پر ننگی تلوار بھی نہیں ہے، بلکہ قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالت ان کی زندگیوں کا محافظ و ضامن ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سزا کا نفاذ صرف غیر مسلموں کے خلاف نہیں ہوا کرتا بلکہ بدبخت مسلمان بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس باب میں رنگ و نسل یا مذہب و وطن کی کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس قانون کے ہوتے ہوئے، جبکہ باقاعدہ ایک عدالتی ذریعہ موجود ہو گا تو پھر کوئی کلمہ گو اپنے طور پر کسی شہری کی جان نہیں لے سکے گا۔ کسی قانون کی عدم موجودگی میں تو کوئی شخص "اپنا قانون" (قتل) بھی لاگو کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر دادرسی یا قانونی چارہ جوئی کا ایک معقول ذریعہ ہو تو اس کے امکانات بالکل محدود بلکہ مفقود ہو جاتے ہیں۔

○ یہ اعتراض بھی بے بنیاد اور بدنیتی کا مظہر ہے کہ اس قانون کو ذاتی دشمنی اور انتقام کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کے قانون انصاف اور نظام عدل میں اس کی مطلقاً" گنجائش نہیں ہے۔ قاضی / جج کسی کے کہنے پر مجرم کو پکڑ کر یوں ہی قتل کا فیصلہ صادر نہیں کر دیتے۔ مدعی کو گواہ اور ثبوت پیش کرنا ہوتے ہیں، نصاب شہادت پورا نہ ہونے یا شبہات کی موجودگی میں فرمانِ نبوی (ﷺ) کے مطابق حدود ساقط کر دی جاتی ہیں۔ اپنے اثرات کے لحاظ سے کم نوعیت کے جرائم پر قانونِ تعزیر حرکت میں آتا۔ اگر مدعی جھوٹا ثابت ہو تو از روئے قانون مستوجبِ سزا ٹھہرے گا۔ بناء بریں ذاتی دشمنی اور انتقام کے تحت تو چوری، ڈاکہ، زنا، قتل، بغاوت اور غداری کے جھوٹے مقدمات بھی درج ہو سکتے اور ہوتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنیاد

پر تو لازم آتا ہے کہ تمام مبینہ جرائم کا قانون اور سزا ختم کر دی جائے۔

○ اہلِ مغرب یہ پروپیگنڈہ کرتے اور بعض جدت گزیدہ نام نہاد مسلمان بھی یہ کہتے ہیں کہ قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالت حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کا قاتل ہے۔ اسے ان لوگوں کی منافقت شعاری، عناد و تضاد اور دوغلا پن ہی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ پوری دنیا میں کسی ایک جگہ بھی اور کسی ملک کے آئین میں حدود و قیود کے بغیر مطلقاً" رائے کی آزادی نہیں دی گئی ہے۔ آزادی رائے کے لئے سبّ و شتم ممنوع اور تہذیب و شائستگی شرط ہے۔

○ دنیا کی ہر ریاست کی طرح تعزیراتِ پاکستان میں بھی یہ بات درج ہے کہ کوئی بھی شخص (مسلمان ہو یا غیر مسلمان) جو پاکستان کے خلاف جنگ و بغاوت کرے یا جنگ کرنے کی کوشش کرے یا جنگ کرنے میں مدد و اعانت کرے تو ایسا شخص سزائے موت کا مستحق ہو گا"۔

مزید برآں یہ کہ قانون، سربراہِ مملکت اور سربراہ حکومت کے خلاف کسی فرد کا اقدامِ بغاوت بھی سزائے موت کو مستوجب ٹھہراتا ہے۔ استدلال یہ ہے کہ آئین و ریاست کے باغی تو مباح الدم ٹھہرے لیکن حضور سرورِ کائنات (ﷺ) کی عزت و ناموس باغی یا حملہ آور کو واجب القتل قرار نہ دیا جائے، چہ معنی دارد؟ پاکستان میں تو قانون اس لیے بھی لازم ہے کہ وطنِ عزیز کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور دینِ اسلام کا سارا یہ قانون و آئین تو فخرِ موجودات تاجدارِ کائنات (ﷺ) نے عطا فرمایا ہے۔ گویا کہ مملکتِ خداداد، پاکستان آپ (ﷺ) کا فیض اور خیرات ہے۔ اور اس کی سلامتی و بقا کے لئے ناگزیر ہے کہ آقا و مولا (ﷺ) کی عزت و ناموس کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔

○ دنیا بھر میں یہ قانون رائج ہے کہاگر کسی شخص کی عوامی ساکھ متاثر ہو اور اس کی

شہرت و مقبولیت کو نقصان پہنچایا جائے تو داد رسی کے لیئے قانون ازالۂ حیثیتِ عرفی موجود اور نافذ العمل ہے۔ ایک عام آدمی کی عزت و حرمت بھی ایک مسلّمہ قدر ہے، جس کا ازالہ کروڑوں ڈالر میں بھی ہو سکتا ہے تو اس کے مقابلے میں امام الانبیاء (ﷺ) کی شان میں زبان کھولنا تو ایسا جرم ہے کہ جس کا ازالہ "مال و دولت کی ایک بڑی سے بڑی مقدار سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) ایک ایسی قدر ہے کہ اس کی سزا صرف اور صرف مجرم و شاتم کا نشان مٹا دینا ہے۔ زندگی اور جان کا نشان۔ ملتِ اسلامیہ کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں پیغمبرانِ خدا کے مابین فرق روا نہیں رکھتے۔ لہٰذا اسلامی قانون میں اللہ کے کسی بھی نبی و رسول (ﷺ) کا گستاخ واجب القتل ہے۔

○ عہدِ حاضر میں بہت سے ممالک نے ہیروئن کے دھندے میں کسی طرح بھی ملوث ہونے والوں کے لیئے سزائے موت کا تعین کر رکھا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ اس زہر کا انسداد ہو۔ اس پہ کوئی اعتراض نہیں اٹھاتا۔ اس قانون کو بنیادی انسانی حقوق کا معاملہ نہیں بنایا گیا۔ درحقیقت یہ قانون انسانی ارتداد کے تحفظ کے لیئے بنایا گیا ہے، اور درست ہے۔ کیونکہ ہیروئن انسان کے لیئے زہرِ قاتل اور انسانیت کی توہین ہے۔ کیا محسنِ انسانیت (ﷺ) کی حرمت و ناموس کا تحفظ ان تمام اقدار سے بڑھ کر نہیں ہے؟ لہٰذا اس پر کسی کا انگشت اعتراض اٹھانا، دراصل کھلی منافقت، بدنیتی اور تضاد بیانی کا عکس ہے۔

○ دنیا کے ہر ملک اور قوم کا قانون، حفاظتِ مال و جان کا حق تسلیم کرتا ہے۔ ذاتی دفاع اور حفاظتِ خود اختیاری کے پہلو پر اجماعِ انسانیت ہے اور اسے ایک ناقابلِ جرح قدر تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۹۶ تا ۱۰۳ بھی ذاتی دفاع کے بارے ہی میں ہے۔ عجیب ہے کہ جسمانی و مادی اعتبار سے تو یہ حق مانا جائے، حفاظتِ خود

اختیاری، یعنی حفاظتِ مال و جان کے تحت ایک فرد کا بیسیوں کو ہلاک کر دینا تو جائز ہو لیکن حفاظتِ دین و ایمان کا سامان کیا جائے تو ناجائز۔ ایمانی و روحانی نقطۂ نگاہ سے یہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور قومی فرض ہے۔ فرضِ کفایہ!

○ اسلامی فقہ کا مزاج بتاتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کی ذات و صفات میں بلا واسطہ توہین پر بھی موت کی سزا بطورِ حد نافذ کی جائے گی۔ اور معافی و توبہ کی مطلقاً" گنجائش نہیں ہے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کا یہ مؤقف سب سے زیادہ حیران کن ہے کہ عہدِ نبوی (ﷺ) اور دورِ صحابہؓ میں مطلق گستاخیٔ رسول (ﷺ) کی بنیاد پر کسی ایک مجرم کو بھی قتل کی سزا نہیں دی گئی۔ حالانکہ قبل ازیں وہ اپنی ایک کتاب "پیغمبرِ انقلاب (ﷺ) (سیرتِ پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ : اشاعت اول ۱۹۸۲)" میں بقلمِ خود یہ لکھ چکے ہیں:

"رسول اللہ (ﷺ) فتحِ مکہ کے موقع پر جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنے فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ وہ کسی سے جنگ نہ کریں۔ الّا یہ کہ کوئی خود ان سے لڑنے کے لیئے آ جائے۔ فتحِ مکہ کے بعد آپ ﷺ نے عمومی طور پر ان سب لوگوں کی معافی کا اعلان کر دیا، جنھوں نے آپ ﷺ کے خلاف سخت ترین جرائم کیئے تھے۔ البتہ آپ نے کچھ لوگوں کی بابت فرمایا کہ وہ قتل کر دیئے جائیں، خواہ وہ کعبہ کے پردے کے نیچے پائے جائیں۔ ابنِ ہشام وغیرہ نے اپنی سیرت کی کتابوں میں نام بنام ان کا ذکر کیا ہے"۔

آئندہ سطور میں مولانا مذکور نے ان کی تفاصیل بیان کی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فتحِ مکہ کے بعد سترہ مردوں اور عورتوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے ہر شخص متعین اور معلوم

شخصی جرم کی بنا پر گردن زدنی تھا۔ تاہم ان میں سے جس شخص نے بھی معافی مانگی یا اس کی طرف سے کسی نے معافی کی درخواست کی، اس کو آپ ﷺ نے معاف فرما دیا۔ معافی طلب کرنے والوں میں سے کسی کو بھی قتل نہیں کیا گیا۔ سترہ آدمیوں کا خون مباح کیا گیا تھا۔ ان میں سے گیارہ آدمیوں کو براہ راست یا بالواسطہ معافی طلب کرنے پر معاف کر دیا گیا۔ پانچ آدمی جنھوں نے معافی کی درخواست نہیں کی، وہ قتل کر دیئے گئے اور ایک آدمی مکہ سے دور بھاگ گیا اور طبعی موت سے اس کا خاتمہ ہوا۔ مولانا کے بیان کے مطابق عبداللہ بن سعد، قریبہ (عبداللہ بن خطل کی باندی)، سارہ (عکرمہ بن ابی جہل کی باندی)، حرث بن ہشام، زُہیر بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، ہبار بن الاسود، وحشی بن حرب، کعب بن زُہیر، عبداللہ بن زبعریٰ اور ہند بنتِ عتبہ (زوجہ ابوسفیان) تو معافی کے حق دار ٹھہرا دیئے گئے تھے۔ ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی، جو شاعر تھا اور شعر کہہ کر آپ ﷺ کا اور آپ ﷺ کے مشن کا استہزاء کیا کرتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر نجران چلا گیا اور وہیں کفر کی موت مرگیا۔ بناء بریں عبداللہ بن خطل، فرتنی، حویرث بن نقیذ بن وہب، مقیس بن صبابہ اور حارث بن طلاطل کو قتل کیا گیا۔ موصوف نے اپنی کتاب کے باب "فتح کے بعد" میں ان کے جرائم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کو عموماً" توہین رسالت (ﷺ) کی پاداش میں قتل کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ بین السطور انہیں چار و ناچار اس بات کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ ان کی سزا کا سبب شتمِ رسولؐ ہی تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ۱۹۸۲ میں تو وہ اپنی تحقیقات سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ گستاخانِ نبی (ﷺ) کو خود رسول اللہ (ﷺ) نے موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا۔ جانے اس کے کئی سال بعد انہیں اپنے اس بیان سے کیونکر انحراف کرنا پڑا؟ اور وہ کیا اسباب تھے کہ ان کا زاویۂ نگاہ یکسر بدل گیا؟ یہ سوال بجائے خود ایک مکمل جواب ہے۔

توہینِ رسالت کی پاکستانی کوششیں

ماہنامہ "نعت" گزشتہ کئی برس سے حضور سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی توہین کا ارتکاب کرنے والے بشیر حسین ناظم اور اقبال احمد فاروقی کا تعاقب کر رہا ہے۔ ان دونوں کا تعلق اہلِ سنت و جماعت (بریلوی مسلک) سے ہے۔ فیصل آباد میں شلواروں کے کپڑے پر حضورِ اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی چھپا۔ ساتھ ہی رحمان، حسّان، عثمان، عمر کے الفاظ بھی چھپے۔ اس پر پریس کانفرنس ہوئی، شاید طارق عزیز شو میں یہ کپڑا دکھایا بھی گیا۔ لیکن اس کپڑے کے قابلِ اعتراض نہ ہونے کے بارے میں جن مولویوں نے فتویٰ دیا، ان کا تعلق بریلوی مسلک سے تھا۔ ان میں سے ایک مولوی آج کل جماعتِ اہلِ سنت کا بہت بڑا عہدیدار ہے۔

حیدر آباد (سندھ) کے ایک مولوی صاحب کے بارے میں بھی آج کل یہ بحث چل رہی ہے کہ اس نے حضور رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کی ہے، اس کا تعلق بھی بریلوی مسلک سے ہے۔ جماعتِ اہلِ سنت نے اس کی بریت کا فتویٰ بھی دے دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا، بریلوی مسلک کے لوگ حضور آقا و مولا علیہ التحیہ والثنا کی ذرا سی گستاخی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ لیکن آج ....

افسوس، صد افسوس

اخبارِ نعت

ناموسِ مصطفیٰ ﷺ ایکشن کمیٹی

○ ۱۔ ۲۳ مئی مولانا قاسم علوی کے مدرسے "کلیتہ الزہرا" (واقع ہُما بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور) میں کمیٹی کا تنظیمی اجلاس ہوا، جس میں مختلف امور زیرِ بحث آئے۔

○ ۲۔ ۲۶ مئی کو کمیٹی کے جی او آر / شادمان یونٹ کا افتتاح بعدِ نمازِ مغرب جامع مسجد شہاب میں ہوا۔ نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ (کنوینر) اور قاسم علوی نے گفتگو کی۔ مدیرِ نعت نے نظم پڑھی۔

○ ۳۔ ۵ جون کو ہمدرد سنٹر (شارعِ غازی علم الدین شہیدؒ) میں "یومِ تجدیدِ وفا" منایا گیا۔ صدارت نذیر احمد غازی نے کی۔ نظامت کے فرائض قاسم علوی نے ادا کیے۔ محمد ثناء اللہ بٹ اور زین الحسن نورانی نے نعت خوانی کی۔ تقریب میں ایسے بیشتر حضرات نے شرکت کی جو ۳۰ مئی ۱۹۹۸ کے فقید المثال جلوس میں شامل تھے۔ لاہور اور بیرونِ لاہور کے مندوبین نے اظہارِ خیال کیا۔ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کی شق (۲۹۵۔ سی۔ تعزیرات پاکستان) کو غیر مؤثر کرنے کی سازش کو ناکام بنانے کا عہد کیا گیا۔

صاحبِ صدارت نے عشقِ رسول ﷺ کے کھوکھلے دعویداروں کے کردار پر نکتہ چینی کی اور ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی حفاظت کے لیے مثبت کردار ادا کرنے والے اداروں اور افراد کی تحسین کی۔ اجلاس میں دوسرے مقررین کے علاوہ، سانحۂ ابوا کے سلسلے میں غیرت مندانہ کردار کرنے والے پیر محمد افضل قادری نے بھی خطاب کیا۔ مدیرِ نعت نے تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے اپنا تازہ مخمس

پڑھا۔

○ ۴۔ ۱۴ جون کو سانحہ ابواء کے سلسلے میں نکلنے والے جلوس میں کمیٹی کی سپریم کونسل کے ارکان اور معاونین نے نذیر احمد غازی (کنوینر) کی قیادت میں شرکت کی۔ جی پی او کے چوک سے چلتے وقت جلوس کے کارپردازوں نے لاؤڈ سپیکر بند کر لیے اور زبانیں دانتوں تلے داب لیں تو کمیٹی کے وفد نے تعجب کا اظہار کیا اور فیروز سنز کے قریب پہنچ کر مایوسی کے عالم میں واپسی اختیار کی۔

○ ۵۔ ۲۱۔ جون کو غازی لاء چیمبر (میکلیگن روڈ، لاہور) میں "قومی زُعما کانفرنس" کے انتظامات کے سلسلے میں میٹنگ ہوئی جس میں کنوینر کے علاوہ قاسم علوی، سید نعیم ایڈووکیٹ، ارشاد اللہ کمال ایڈووکیٹ، ظہور اللہ چشتی، مولانا نواز درویش، علامہ ابابیل، محمد دانیال رضا قادری، محمد الماس شاہ اور مدیرِ نعت شامل ہوئے۔ مختلف امور پر فیصلے کیے گئے۔

○ ۶۔ ۲۳ جون کو ہمدرد سنٹر کی سماعت گاہ علی ہجویریؒ میں کمیٹی کے زیرِ اہتمام "قومی زُعما کانفرنس" منعقد ہوئی۔ صدارت محمد اکرم اعوان (امیر تنظیم الاخوان) نے کی۔ جنرل کے ایم اظہر، مولانا محمد اجمل قادری، صاحبزادہ محمد امجد خاں، سید کفیل شاہ بخاری، مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی، صاحبزادہ طاہر مبین، حافظ عبدالرحمان مدنی، واجد علی خاں، سید خورشید احمد گیلانی، مولانا محمد قاسم علوی وغیرہ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے قرار دیا کہ ناموسِ رسالت کے تحفظ کی دفعہ ۲۹۵ سی کو غیر مؤثر کرنے کی سازش کو کسی صورت میں کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور کارگل (کشمیر) سے پسپائی اختیار کرنا بزدلی اور بے غیرتی ہے جسے قوم کسی صورت برداشت نہیں کرے گی۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد محمد ثناء اللہ بٹ نے مدیرِ نعت کی نعت پڑھی جو اِسی اشاعت میں الگ شائع کی جا رہی ہے۔ مشترکہ اعلامیہ مدیرِ نعت راجا رشید محمود نے پڑھا اور زُعما نے اس پر دستخط کیے۔

قومی زُعما کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ بھی قارئین کے ریکارڈ کے لیے چھاپی جا رہی ہے۔

○ ۷۔ ۷ جولائی کو تنظیم الاخوان نے ناموسِ مصطفیٰ ﷺ ایکشن کمیٹی کے تعاون سے کارگل پر پسپائی اختیار کرنے کے خلاف جلوس نکالا جو مسجدِ شہدا سے اسمبلی ہال تک گیا۔ جلوس میں تنظیم الاخوان کے رہنماؤں کے علاوہ نذیر احمد غازی نے بھی خطاب کیا۔

○ ۸۔ ۲۱ جولائی کو کمیٹی کے کنوینر نے دعوتِ عمرہ کے دفتر اور دعوتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام چلنے والے مدرسۃ المدینہ اور گنبدِ خضرا اکیڈمی کا دورہ کیا۔ شاہ شمس قاریؒ کے معاونین نے یونٹ کے باقاعدہ افتتاح کے لیے کنوینر سے وقت مانگا۔ اصولی طور پر بات مان لی گئی، تاریخ بعد میں طے ہوگی۔

متفرقات

○ ۱۔ ۲۲ مئی کو بعدِ نمازِ عشا جامع مسجد تجلّی کعبہ، شادمان چوک میں "سانحہ ابواء کانفرنس" ہوئی جس میں مدیرِ نعت نے نظم پڑھی۔

○ ۲۔ ۲۸ مئی (۱۲ صفر المظفر) کو ایوانِ درود و سلام کے زیرِ اہتمام ۱۰۸ واں حلقۂ درودِ پاک حسبِ روایت بعد نمازِ عصر، جامع مسجد عکسِ گنبدِ خضرا، پل نہر، اپر مال میں قائم ہوا۔ مدیرِ نعت نے گفتگو کی اور اپنا تازہ نعتیہ مخمس سنایا۔ محمد ثناء اللہ بٹ، سجاد حسن اور دیگر حضرات نے نعت خوانی کی۔ ملک الطاف حسین قادری ناظمِ تقریب تھے۔ اجلاس کے آخر میں عمرے کے لیے قرعہ اندازی کی گئی۔ ناصر حسین انصاری خوش نصیب ثابت ہوئے۔

○ ۳۔ "داتا" دربار کمپلیکس" کے افتتاح کے موقع پر، یکم جون کو صبح ۹ بجے "سیّدِ ہجویرؒ تصوّف سیمینار" ہوا، جس میں مدیرِ نعت نے مسدّس کی صورت میں حضرت علی ہجویری

داتا گنج بخشؒ کی منقبت پڑھی۔

○ ۴۔ یکم جون کو بعد نمازِ عشا داتا" دربار کمپلیکس کے سماع ہال میں مشاعرۂ نعت و منقبت ہوا جس میں مدیرِ نعت نے پنجابی نعت سنائی۔ ڈاکٹر عصمت اللہ زاہدؔ ناظمِ مشاعرہ تھے۔ مشاعرے کی روداد ۹ جولائی کے روزنامے "نوائے وقت" لاہور میں شائع ہوئی۔

○ ۵۔ یکم جون کو بعد نمازِ ظہر ریڈیو پاکستان لاہور میں محفلِ میلاد منعقد ہوئی جس میں مدیرِ نعت نے تقریر کی۔ یہ محفلِ میلاد ۳ جون کو نشر ہوئی۔

○ ۶۔ ۳ جون کو حبیب الرحمان خان کے ہاں حسن ٹاؤن میں حلقۂ درود پاک قائم ہوا، اور محفلِ میلاد ہوئی جس میں غلام محمد، ناصر حسین انصاری اور مدیرِ نعت کے علاوہ بہت سے لوگ شریک ہوئے۔

○ ۷۔ ۱۰ جون کو صبح ۹ بجے محکمۂ اوقاف پنجاب، پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان کے اشتراک سے صوبائی مقابلۂ نعت خوانی ہوا۔ مدیرِ نعت (منصفِ اعلیٰ) کے ساتھ الطاف الرحمان پاشا اور ماسٹر منظور نے مُنصفین کے فرائض انجام دیئے۔ ٹی وی کے سینئر پروڈیوسر کرامت مغل اور ریڈیو پاکستان کے سینئر پروڈیوسر ذوالفقار کاظم نے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ غازی مونگیری ناظمِ تقریب تھے۔ مدیرِ نعت نے نتائج کا اعلان کیا۔ یہ تقریب ۱۸ جون کو ریڈیو پر اور ۱۹ جون کو ٹی وی پر پیش کی گئی۔

○ ۸۔ ۱۵ جون کو "ایوانِ وقت" میں ایک نعتیہ مشاعرہ ہوا جس میں مدیرِ نعت نے بھی شرکت کی۔ صدارت عبدالعزیز خالدؔ نے کی۔ مشاعرے کی رپورٹ ۲۵ جون کے روزنامہ "نوائے وقت" (جریدۂ ادب) میں شائع ہوئی۔

○ ۹۔ ۱۹ جون کو صبح ۹ بجے بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن میں طلبہ و طالبات کا مقابلۂ نعت خوانی ہوا۔ جس میں پروفیسر صدیق اکبر، قاری نذیر احمد اور مدیرِ نعت منصف تھے۔ مدیرِ نعت نے منصف اعلی کے طور پر نتائج کا اعلان بھی کیا اور گفتگو بھی کی۔ ملک الطاف حسین قادری نے نظامت کی۔

○ ۱۰۔ ۲۱ جون (پیر) کو گیارہ بجے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے کانفرنس ہال میں محفلِ میلاد منعقد ہوئی جس میں پروفیسر سعید احمد خاں بھٹی نے تقریر کی۔ مدیرِ نعت نے اپنا نعتیہ کلام پڑھا۔ مختلف حضرات نے نعت خوانی کی۔

○ ۱۱۔ ۲۲ جون کو سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ میں طلبہ و طالبات کے درمیان مقابلۂ تقاریر (بسلسلۂ یومِ آزادی) ہوا۔ مدیرِ نعت (منصفِ اعلیٰ) کے ساتھ پروفیسر راؤ ارتضٰی حسین اشرفی اور پروفیسر نواز زیدی منصفین تھے۔ مدیرِ نعت نے گفتگو کی اور نتائج کا اعلان کیا۔

○ ۱۲۔ ۲۴ جون کو ایوانِ درود و سلام کے فعّال رکن ناصر حسین انصاری کے ہاں (واقع جی او آر' نزد شاہ شمس قاری") محفلِ میلاد ہوئی جس میں نعتیں پڑھی گئیں اور مدیرِ نعت کی گفتگو ہوئی۔

○ ۱۳۔ ۲۶ جون کو مدیرِ نعت' رسالے کے دونوں ڈپٹی ایڈیٹرز (شہناز کوثر اور اظہر محمود) کے ساتھ اسلام آباد گئے اور ۲۷ جون (۱۲ ربیع الاول) کو قومی سیرت کانفرنس میں شرکت کی۔ دونوں ڈپٹی ایڈیٹرز نے صدرِ پاکستان سے صدارتی ایوارڈ لیے۔

○ ۱۴۔ ۱۲ ربیع الاول شریف (۲۷ جون) کو حسبِ روایت صبح سات بجے فیاض حسین چشتی کے ہاں مسلم ٹاؤن میں محفلِ درودِ پاک ہوئی اور بعدِ نمازِ عصر جامع مسجد عکسِ گنبدِ خضرا میں ۱۰۹ واں حلقۂ درودِ پاک قائم ہوا۔ دونوں محفلیں عقیدت و احترام کی فضا میں منعقد ہوئیں۔ مدیرِ نعت قومی سیرت کانفرنس میں شرکت کی وجہ سے اِن محافل میں شرکت کی سعادت سے محروم رہے۔

○ ۱۵۔ ۲۸ جون کو بعدِ نمازِ عصر مین مارکیٹ گلبرگ میں محفلِ میلاد ہوئی جس میں مدیرِ نعت کے علاوہ ایوانِ درود و سلام کے محترم کارکن ملک الطاف حسین قادری نے گفتگو کی۔

○ ۱۶۔ ۳۰ جون کو بعدِ نمازِ عشا راوی روڈ پر محفلِ میلاد ہوئی۔ جس میں نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ شریک ہوئے لیکن خاموش رہے۔ مدیرِ نعت نے نعت پڑھی اور مقابلہ کیا۔

○ ۱۷۔ یکم جولائی کو بعدِ نمازِ عصر' حضرت شاہ ابو المعالیؒ کے عرس کے موقع پر ہونے والی محفلِ نعت میں مدیرِ نعت نے غلام محمد مدنی' تسنیم الدین احمد اور ناصر حسین انصاری کی ہمراہی میں شرکت کی۔ محفلِ نعت کا اہتمام مرزا محمد یوسف نے کیا تھا۔

○ ۱۸۔ ۴ جولائی کو لالہ رُخ کالونی' واہ کینٹ میں صبح سات بجے جلسۂ میلاد ہوا جس میں مدیرِ نعت نے "محبتِ رسول ﷺ" کے موضوع پر ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کی۔ مقامی نعت خوانوں نے نعتیں پڑھیں۔

○ ۱۹۔ ۸ جولائی کو صبح ۹ بجے مدیرِ نعت اور ڈپٹی ایڈیٹر اظہر محمود نے "صوبائی سیرت کانفرنس" میں شرکت کی اور صوبائی وزیرِ مذہبی امور سے "سیرت ایوارڈ" وصول کیے۔

○ ۲۰۔ ۸ جولائی کو بعد نمازِ عصر جی او آر میں غلام محمد مدنی کے والد شیخ امام الدین کے ایصالِ ثواب کی محفل میں مدیرِ نعت نے گفتگو کی۔

○ ۲۱۔ ۹ جولائی کو نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ کے ہاں نیو گارڈن ٹاؤن میں سالانہ محفلِ میلاد ہوئی جس میں تنظیم الاخوان پاکستان کے امیر' محمد اکرم اعوان اور پروفیسر ڈاکٹر محمد قمر علی زیدی نے گفتگو کی۔ نثار اکبر آبادی' منظور الحق مخدوم (حافظ آباد) اور مدیرِ نعت نے اپنا نعتیہ کلام سنایا اور محمد ثناء اللہ بٹ' شہزاد ناگی' محمد عمر بٹ' حکیم فرزند علی نے نعت خوانی کی۔

○ ۲۲۔ ۱۱ جولائی کو مدیرِ نعت کے ہاں سالانہ محفلِ میلاد منعقد ہوئی جس میں حسبِ روایت پہلے خاموشی سے درودِ پاک پڑھا گیا۔ بعد میں محمد ثناء اللہ بٹ' سید محمد رضا

زیدی اور عبدالسلام اعجاز نے نعت خوانی کی۔ نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ نے "تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ" کے موضوع پر اور مدیرِ نعت نے ۲۶ ربیع الاول (یوم الحزن) کے حوالے سے حضرت ابوطالبؓ کے مناقب کے سلسلے میں گفتگو کی۔ اسی دن مدیرِ نعت کے دوست پروفیسر سیّد سجّاد رضوی فوت ہوئے تھے۔ اجلاس میں ان کے لیئے دعائے مغفرت کی گئی۔

○ ۲۳۔ مدیرِ نعت اور غلام محمد مدنی نے "دعوتِ عمرہ" کے نام سے زیارتِ حرمین شریفین کے لیے گروپ ترتیب دے کر ساتھ لے جانے کا کام ۱۹۹۷ میں شروع کیا تھا۔ اُس سال چار گروپ گئے۔ ۱۹۹۸ میں پانچ گروپوں کی صورت میں اربابِ محبّت نے یہ سعادت حاصل کی۔ ۱۹۹۹ میں پہلا گروپ ۱۹ جولائی کو غلام محمد مدنی کی رہنمائی میں روانہ ہوا ہے جو ۳۰ اگست کو واپس آئے گا۔ ۱۶ جولائی کو بعد نمازِ عصر جامع مسجد عکسِ گنبدِ خضرا میں عازمینِ عمرہ و زیارتِ روضۂ رسولِ کریم ﷺ کے لیے حسبِ روایت "بریفنگ میٹنگ" کا اہتمام کیا گیا جس میں مدینۂ طیّبہ کے باسی غلام احمد قادری مہمانِ خصوصی تھے۔ حسبِ معمول مدیرِ نعت نے بریفنگ دی۔

ضروری اعلان

ماہنامہ "نعت" اب تک بفضلہٖ تعالیٰ باقاعدہ اشاعت رکھتا ہے لیکن ۱۹۹۹ کے بعض شماروں میں جلد نمبر درست نہیں چھپا۔ رسالہ جنوری ۱۹۸۸ کو شروع ہوا تھا۔ جنوری ۱۹۹۹ سے جلد ۱۲ ہی چل رہی ہے۔ ازراہِ کرم قارئینِ محترم درست کرلیں۔

آئندہ شمارہ　　**ستمبر ۱۹۹۹**　　**مخمّساتِ نعت**

"قومی زُعَماء کانفرنس کی جھلکیاں"

ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے مسئلے پر غیرت وحمیّتِ دینی کا مظاہرہ نہ کرنے والوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ---- نذیر احمد غازی

○ اسی شہر لاہور میں ایک نوجوان غازی علم الدین شہیدؒ کا فکر و عمل ہماری راہنمائی کے لیے موجود ہے۔ (سید خورشید احمد گیلانی)

○ میرا تو خیال ہے کہ قانون 295 سی اقلیتوں کا محافظ ہے .... (جنرل کے۔ ایم۔ اظہر)

بابری چوک (جَین مندر) سے مزنگ چونگی کی طرف رواں دواں غازی علم الدین شہیدؒ روڈ (لٹن روڈ) پر واقع ہمدرد سنٹر کی علی ہجویریؒ سماعت گاہ میں قومی و ملکی قائدین و عمائدین اور ان کے نمائندوں کا بھرپور اجتماع خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ ۲۳۔ جون کو منعقدہ "قومی زُعَماء کانفرنس" میں ہر قابلِ ذکر جماعت کے رہنما شریک ہوئے۔

"ناموسِ مصطفیٰ ﷺ ایکشن کمیٹی" جذبۂ حُبّ الوطنی سے سرشار اور ملّی و دینی درد رکھنے والے باشعور افراد کا ایک منظّم و متحرک پلیٹ فارم ہے۔ انہوں نے گزشتہ برس ۳۰۔ مئی ۱۹۹۸ کو قانونِ ناموسِ رسول ﷺ موسومہ 295 سی اور اس کے ذیلی دفعات کے حق میں داتا دربار سے اسمبلی ہال تک ایک ناقابلِ فراموش جلوس کا اہتمام کیا اور خدا کے حضور لاکھوں افراد نے یہ عہد دیا تھا کہ اگر اس قانون میں کسی قسم کی تبدیلی یا منسوخی کے بارے میں سوچا گیا تو ہم غازی علم الدین شہیدؒ کے راستے کا انتخاب کریں گے۔ تب ان کا دوسرا بڑا مطالبہ یہ تھا کہ بھارت کے جواب میں پاکستان کو بہرحال ایٹمی

دھماکہ کر دینا اور اس سلسلے میں کسی طرح کے دباؤ یا مصلحت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

اس تاریخی جلوس کا اعلان ہوتے ہی ہر حلقہ سے یہ آواز بلند ہونا شروع ہو گئی۔ اور ابھی اس عظیم الشان اجتماع کے انعقاد میں دو دن باقی تھے کہ مسلمانانِ عالم کے چہرے ایٹمی دھماکہ کی خوشخبری سن کر امیدوں سے تمتما اٹھے۔ بناء بریں حکومت کی طرف سے عاشقانِ رسول ﷺ کا یہ جوش و خروش اور وابستگی و شیفتگی دیکھ کر مذکورہ قانون میں تبدیلی کے بیانات اور اقدامات کا سلسلہ بھی مکمل طور پر روک دیا گیا تھا۔

اب کے حکومتی حلقوں کی طرف سے پھر اس قسم کی باتیں ہونے لگی تھیں، اور بعض وزراء مختلف مواقع پر وقتاً فوقتاً عندیہ ظاہر کر رہے تھے کہ قانونِ ناموسِ رسالت کے تحت ایف۔ آئی۔ آر کے اندراج اور تفتیش کے طریقۂ کار میں تبدیلی کا باضابطہ فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ کہ وزیرِ اعظم اس میں ترمیم کا باقاعدہ حکم جاری کر چکے ہیں اور یہ خبر ۱۴ جون ۱۹۹۹ کے صبح کے اخبارات، جنگ، نوائے وقت اور خبریں میں بھی آ چکی ہے۔ نواز شریف کابینہ کے ایک وزیر راجہ ظفر الحق نے گوجرانوالہ میں عیسائیوں کے ایک کنونشن میں اس امر کا کھل کر اظہار کیا۔ جس سے پورے ملک میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور جابجا غم و غصہ کا اظہار ہونے لگا۔ بے چینی کے اس ماحول میں "ناموسِ مصطفیٰ ﷺ ایکشن کمیٹی" نے اپنے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے اس پُروقار اور سنجیدہ کانفرنس کا بروقت اہتمام کیا۔ جس کے داعی و میزبان مشہور قانون دان، منجھے ہوئے مقرر، معروف دانشور، مبلغ اسلام اور مفکر و مدبر جناب نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ تھے۔ ایجنڈے پر قانونِ ناموسِ رسالت کے علاوہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی تازہ ترین صورتحال بھی تھی۔ ان دو اہم امور پر قومی زعماء نے کھل کر اظہار خیال کیا اور پوری ملتِ اسلامیہ کو دعوتِ فکر و عمل دی۔

"قومی زعماء کانفرنس" تنظیم الاخوان کے امیر جناب مولانا محمد اکرم اعوان

صاحب کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ دیگر شرکاء میں مندرجہ ذیل زعماء بطورِ خاص قابل ذکر ہیں: جنرل کے۔ ایم اظہر صاحب (جمعیتِ علماءِ پاکستان)، سیّد کفیل بخاری شاہ صاحب (تحریکِ مجلسِ احرارِ اسلام)، مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی (عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت)، صاحبزادہ محمد امجد خان صاحب (جمعیت علمائے اسلام)، صاحبزادہ میاں محمد اجمل قادری صاحب (جمعیت علمائے اسلام)، صاحبزادہ محمد طاہر مبین صاحب (جمعیت المشائخ)، مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی (جمعیت اہلحدیث / مجلسِ تحقیق اسلامی پاکستان)، جناب واجد علی خان صاحب (تحریکِ انصاف)، صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی صاحب (نامور ادیب و خطیب)، مولانا محمد قاسم علوی صاحب (انجمن اساتذۂ پاکستان)، محمد اسلم سعیدی صاحب (مصطفائی تحریک / انجمن طلباءِ اسلام)، عظیم دانشور راجا رشید محمود (ناموسِ مصطفیٰ ﷺ ایکشن کمیٹی)، قاری محمد ظہور اللہ چشتی، مولانا محمد نواز درویش، سید محمد الماس رضا شاہ بخاری، محمد دانیال رضا قادری، حلقہ سیفیہ کے راہنما اور قرآن و سنت کی عالمگیر تنظیم دعوتِ اسلامی کے معزز نمائندگان ان کے علاوہ ہیں۔ ہال مدعوئین سے بھرا پڑا تھا۔ مقررہ وقت پر اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ تلاوتِ قرآنِ مجید کے لیئے قاری محمد رمضان سعیدی صاحب تشریف رکھتے تھے۔ ازاں بعد موقع کی مناسبت سے ملک کے نامور نعت خواں، ثناء اللہ بٹ صاحب نے زندہ و اسلامی لہجے کے شاعر، جناب راجا رشید محمودؔ صاحب کا کلام پڑھا۔ سامعین پر سوز و مستی چھا چکی تھی۔ مقطع میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ مجمع پھڑک کر رہ گیا۔

ہم جان وار سکتے ہیں محمودؔ بے خطر
کرتے ہوئے حفاظتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

قومی زعماء کانفرنس کے میزبان اور ناموسِ مصطفیٰ ﷺ ایکشن کمیٹی کے مرکزی کنوینر جناب نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ نے استقبالیہ خطبے میں حسبِ معمول بڑی پُر مغز

اور جامع گفتگو کی۔ مسئلۂ کشمیر اور تحریکِ گستاخیٔ رسولؐ کے پس منظر و پیش منظر کی حقیقت کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ انہوں نے بتایا: "ناموسِ مصطفیٰؐ ایکشن کمیٹی" نے ملک کی تمام دینی اور دین پسند جماعتوں کو آج کے لئے مدعو کیا تھا۔ بعض رہنما کانفرنس میں اپنی حیثیت کا تعین چاہتے تھے۔ کئی ایک کے نزدیک یہ پروگرام ان کے قد سے نیچے یا اوپر کا ہے۔ الغرض یہ کہ ہمارے مشائخ و علماء جانے کیوں' ہر نازک لمحہ میں اپنے قد اور جسم کے ناپ تول کے چکر میں ہی پڑے رہتے ہیں مگر ہمیں تو بہرحال سرکارِ مدینہ (ﷺ) کی ناموس و حُرمت کی چوکیداری کرنا ہے۔ جو احباب تشریف لائے ہیں' وہ دراصل اپنے آقا و مولا (ﷺ) کی مُحبّت میں آئے اور جو نہیں آئے' ان کے لئے شاید وہاں سے منظوری نہ تھی۔ ان میں سے چند وہ لوگ بھی ہیں' جنہوں نے بروقت ہمیں فون پر اطلاع کی کہ وہ کسی وجہ سے پروگرام میں نہیں پہنچ پائیں گے۔

انہوں نے اپنے جاندار افتتاحیہ خطاب میں مزید کہا: "حکومت نے یہود و نصاریٰ کے دباؤ میں آ کر یہ طے کر لیا ہے کہ 295 سی میں پرچہ کے اندراج اور طریقۂ تفتیش میں ترمیم و تنسیخ کر کے اسے عملاً غیر مؤثر بنا دیا جائے۔ حکومتی حلقوں کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے کہ کسی بھی جگہ توہینِ رسالت کے واقعہ پر ایک کمیٹی تشکیل دیں گے جو اقلیتوں کی جانب سے دو عیسائی نمائندوں' دو حکومتی نمائندوں (ڈی سی اور ایس پی) اور دو ٹوڈی مولویوں پر مشتمل ہو گی' اور پھر یہ متفقہ طور پر رائے دیں گے کہ گستاخیٔ رسولؐ کا کوئی واقعہ ہوا بھی ہے کہ نہیں؟ اور ایف آئی آر کا اندراج ہونا بھی چاہئے کہ نہیں؟ اِس طرح اِس قانون کی جو دُرگت بنے گی اور ان اقدامات سے حکومت جو کچھ چاہتی ہے وہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔

حکومت کے دوست نما دشمنوں نے اِس اقدام کی منطق کے طور پر ایک

فرسودہ و آلودہ دلیل گھڑی ہے کہ یوں کسی بے گناہ کو سزا نہیں ملے گی اور یہ کہ اقلیت کے کسی فرد کو اس بہانے ذاتی انتقام کا نشانہ بھی نہیں بنایا جا سکے گا۔ حالانکہ پاکستان کے مروّجہ قانون میں یہ بات پہلے سے ہی موجود ہے کہ کسی ایسے مقدمہ میں جس پر موت یا عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے' غلط شہادت دینے والے کو بھی موت یا عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بے نظیر حکومت میں خود میاں نواز شریف صاحب نے قانونِ ناموسِ رسالت کی حمایت میں ملک گیر ہڑتال کی کال دی تھی۔ مگر اب وہ خود وزیرِ اعظم ہیں تو ان کے رویّے تبدیل کیوں ہو گئے ہیں۔ واضح رہے کہ اِس ملک کی بقا' حضور آقا و مولا (ﷺ) سے وفاداری میں مضمر ہے' اور یہ آپ ﷺ کے فیضان اور رحمت و توجُّہ سے ہی وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کے حکمران اس سے غداری کر کے ایک دن بھی باقی نہیں رہیں گے۔ ہم نے اس مقصد کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اِن شاء اللہ العزیز' اب بھی کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں حکومتِ پاکستان اور مسلم لیگ کی قیادت کو توجُّہ دلاتا ہوں کہ وہ ہوش کے ناخن لیں اور اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی نہ ماریں۔ مولانا محمد علی جوہر نے شاید ان کی غیرت جھنجھوڑنے کے لئے ہی یہ شعر کہا تھا:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کشمیر کی تازہ ترین صورتِ حال اور کارگل کا محاذ بھی ہمارا آج کا ایک خاص موضوع ہے۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ ہمارے وزیرِ اعظم کی طرف سے کہا گیا ہم اپنے پچاس سالہ مؤقف سے دستبردار ہونے کے لئے بھی تیار ہیں۔ یہ کیا بے حسی ہے کہ بھارتی افواج ایک عرصہ سے کشمیر کے بارڈر پر ظلم کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں پوری ہندو قوم

حالت جنگ میں ہے اور جنگ کے لیئے تیار ہے۔ ادھر پاکستانی قوم کو تذبذب میں رکھا اور الجھایا جا رہا ہے۔ جنگی صورتحال کے لیئے قوم کو قطعاً تیار نہیں کیا جا رہا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ فرزندانِ اسلام کے دلوں میں جذبۂ شہادت ابھارا جاتا اور مجاہدین سے عملاً" اظہارِ یکجہتی ہوتا لیکن وطنِ عزیز کی مجموعی فضا اور صورتِ حال ناقابلِ برداشت حد تک بگڑی اور الجھی ہوئی ہے۔ حکومتی حلقوں سے متواتر" سب اچھا ہے" کی رٹ لگائی جارہی ہے' جو مطلقاً" اچھا نہیں ہے۔ 1965 کے مقابلے میں نفسیاتی اعتبار سے اب ہماری پوزیشن صفر ہے۔ درحقیقت ہمیں اب تک اعلانِ جہاد کر دینا چاہیئے تھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آیا۔ اس وقت رہ رہ کر مجھے ساغر صدیقی مرحوم کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو ملک کی موجودہ صورتحال کی مناسبت سے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔

وہ وقت بھی دیکھا ہے تاریخ کی گھڑیوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

آج غزوۂ ہند کا عملی معرکہ درپیش ہے۔ وہ غزوۂ ہند' جس کے بارے میں نبئ پاک ﷺ کی باقاعدہ دو احادیثِ مبارکہ موجود ہیں کہ کفارِ ہند کے خلاف جہاد میں حصہ لینے والے بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں جائیں گے۔ آخر میں' ایک بات واضح کرتا ہوں کہ بھارت ہمیشہ سے کہتا آرہا ہے کہ کشمیر ہمارا اٹوٹ رنگ ہے۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ جب تک ہم بھارت کا انگ انگ توڑ کر نہیں رکھ دیتے' کشمیر کبھی آزاد نہیں ہو گا۔

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی نے ناموسِ مصطفیٰؐ ایکشن کمیٹی کی مکمل تائید کرتے ہوئے کہا کہ اسی شہر لاہور میں ایک نوجوان غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کا فکر و عمل ہماری راہنمائی کے لیئے موجود ہے۔ یہی جذبۂ عشقِ رسولؐ ہر اچھے اور سچے

مسلمان کا شیوہ ہے۔ یورپ اور اسلام کا انسان کے بارے میں بالکل مختلف نظریہ ہے۔ قانونِ ناموسِ رسولؐ اور مسئلۂ کشمیر کے حوالے سے برادرم غازی صاحب نے پُر مغز اور جاندار گفتگو کی ہے' میرے جذبات ہو بہو وہی ہیں اور میں ان کی مکمل حمایت . کا اعلان کرتا ہوں۔ ہم مسلمانوں کے حسبِ حال ایک شعر بہت خوب ہے۔

پروانے کا حال اس محفل میں' ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک شب میں ہی یہ پیدا بھی ہوا' عاشق بھی ہُوا اور مر بھی گیا

پاکستان عوامی تحریک اور پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے نمائندے کا خیال تھا کہ حکومت کو دینی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پسند کے اور محاذ کھول دینے جائیں۔ تاکہ ہندو ظالم کی کارگل سے توجہ بٹ اور ہٹ سکے۔ ان کے بعد امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے نواسے' جناب سیّد کفیل شاہ بخاری نے اظہارِ خیال کیا اور کہا کہ پاکستان کے اکثر حکمران یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ اور دلال رہے ہیں۔ غیر مسلموں اور امریکہ کے بے غیرت حکمرانوں' دلّالوں اور دُم چھلّوں نے پروگرام بنا رکھا ہے کہ وطنِ عزیز سے دینی غیرت کا قسط وار جنازہ نکالیں گے۔ موجودہ حکمران بھی انہی کا تسلسل ہیں۔ یہ کنجر سوسائٹی کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے دشمنوں سے دوستی کا دم بھریں گے' ہمارے دل میں ان حکمرانوں کے لیئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں صدرِ مملکت جناب محمد رفیق تارڑ کے بارے میں بھی بعض اشارے کیئے کہ ان کا کردار بھی حکومت میں آنے کے بعد مردِ مجاہد اور مردِ مومن کا نہیں ہے بلکہ وہ محض پریذیڈنٹ ہاؤس میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔

جناب واجد علی خاں صاحب نے بتایا کہ میں اپنی جماعت کے سربراہ عمران خان صاحب کی خصوصی ہدایت پر اس کانفرنس میں شریک ہوا ہوں۔ قانونِ ناموسِ

رسالت پر دباؤ اور الجھاؤ کا شکار ہونے والے لعنتی ازلی بدبخت ہیں۔ جب یہ قانون بنا تو راجہ ظفر الحق صاحب، جنرل ضیاء الحق کی ٹیم کے کپتان تھے۔ اب اسی قانون میں ترمیم و تنسیخ کی باتیں کم از کم ان کو تو نہیں کرنی چاہیں۔ بناء بریں میرا خیال ہے کہ حکمران، لیلیٰ اقتدار کے لالچ میں دباؤ کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پاکستان کا رائے ونڈ فارم کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

جناب مولانا محمد اسمٰعیل شجاع آبادی نے نہایت جچے تلے الفاظ میں تجزیہ کیا اور کہا کہ اربابِ اقتدار، بے نظیر بھٹو ہوں یا میاں نواز شریف، اس مسئلے پر ہم خیال، ہم مزاج، ہم قدم، ہم فکر اور ہم رنگ ہیں۔ یہ لوگ فطرتاً" سیکولر ہیں۔ محض زبانی جمع خرچ کی حد تک اپنے سیاسی مفاد کے لئے اسلام کا نام لیتے ہیں" ہم نے اس مسئلہ کے لئے 1953ء میں ایک عظیم الشان تحریک چلائی اور بے بہا قربانیاں پیش کی تھیں۔ پھر 1974ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں مسلمانوں نے اپنے ایمان کا شاندار مظاہرہ کیا۔ ہم اب بھی اس کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ حکمران جو کبھی اسلام کا نام لیتے ہوئے نہیں تھکتے تھے، اب گستاخانِ رسولؐ کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے روبرو، کاذب یوسف کے بارے میں کہا کہ اگر اسے رہا کر دیا جائے تو حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ بناء بریں یہ ریاض احمد گوہر شاہی کے بھی محافظ بن بیٹھے ہیں۔ مزید بر آں یہ کہ مرشد مسیح نامی ایک گستاخِ رسولؐ اس وقت انجمن احمدیہ لاہوری گروپ کی پناہ میں ہے اور بار بار ہماری توجہ دلانے کے باوجود انتظامیہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔

صاحبزادہ محمد امجد خاں نے کہا آج اسلام آباد میں انہی ہدایات بلکہ احکامات پر عمل ہوتا ہے۔ جو انہیں واشنگٹن سے وصول ہوتے ہیں۔ ہم اس فورم میں کھل کر

اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ حکومت کے ان اقدامات اور بے حسی کے خلاف پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ہر جگہ جنگ لڑیں گے۔

مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب نے کہا کہ قانون 295-C پر وفاقی شرعی عدالت تصدیق و توثیق کر چکی ہے۔ یہ عدلیہ کا فیصلہ اور قانون ہے۔ اس کو چھیڑنا توہینِ عدالت کے مترادف ہے۔

صاحبزادہ میاں محمد اجمل قادری صاحب نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا کہ اِس قسم کی باتیں اسلامی قوتوں کے انتشار کے سبب سے ہو رہی ہیں اور حکمرانوں نے اس امر کا حوصلہ پکڑا ہے۔ اگر ہم باہم متحد ہو کر غیر لچکدار مُوقف اختیار کر لیں تو اسے کوئی مائی کا لال چھیڑنے کی کوشش نہیں کر سکے گا۔ وزیرِ اعظم نے کشمیر کے بارے میں یہ بیان دے کر کہ ہم اپنے پچاس سالہ مُوقف سے دستبردار ہونے کے لئے بھی تیار ہیں، دراصل حلف سے غداری کی ہے۔

ناموسِ مصطفیٰؐ ایکشن کمیٹی کے سیکرٹری جنرل راجا رشید محمودؔ صاحب نے مشترکہ اعلامیہ پڑھا، جس میں کہا گیا کہ ہم قانون 295-C کے تحت پرچہ کے اندراج اور تفتیشی طریقۂ کار میں تبدیلی کے عمل کی مذمت اور بھرپور مخالفت کرتے ہیں۔ نیز بھرپور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ حکومت مسئلۂ کشمیر کے بارے میں جرأت مندانہ مُوقف اختیار کرے اور دنیا بھر میں گستاخانِ رسول (ﷺ)، خواہ سلمان رُشدی ہو یا تسلیمہ نسرین ہر جگہ ہر رنگ میں ان کا تعاقب کیا جائے۔ یہ کوئی عام مسئلہ ہرگز نہیں بلکہ مسلمان قوم کی فنا و بقا کا راز اسی میں ہے۔

جنرل کے ایم اظہر صاحب نے بڑا پُر مغز اور ایمان پرور خطاب فرمایا۔ انہوں نے کیا کہ نظامِ مصطفیٰ کا نفاذ اور مقامِ مصطفیٰ (ﷺ) کا تحفظ تو ہمارے دستور و منشور کی بنیاد ہے۔ اس کے لیے ہمیشہ قربانیاں دیتے آئے ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔

میرا خیال ہے کہ قانون 295 سی اقلیتوں کا محافظ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے عدالتی وقانونی چارہ جوئی کے دروازے کھلے رہتے ہیں اور عوام طیش و غضب میں آکر خود قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتے۔ وگرنہ ہر موقع پر راجپال کو واصل فی النار کر دینے کے لیئے علم الدین جنم لیتے رہیں گے۔

انہوں نے مزید کہا کہ حکومتِ پاکستان کا مسئلہ کشمیر اور کارگل کے محاذ کے بارے میں رویہ سوفی صد معذرت خواہانہ و منافقانہ ہے۔ انہیں غیر لچکدار، مضبوط اور واضح نقطہ نگاہ اختیار کرنا چاہیے اور اعلانِ جہاد کئے بغیر قوم کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں ہے"انجمنِ اساتذۂ پاکستان کے، مولانا قاسم علوی صاحب نے ایک قرار داد پیش کی جسے اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جسٹس عارف اقبال بھٹی کے قتل کے مقدمے میں ناجائز ملوث غازی احمد شیر نیازی پر سے جھوٹا مقدمہ خارج کیا جائے۔ اور انہیں باعزت بَری کیا جائے۔

صاحبِ صدارت مولانا محمد اکرم اعوان نے کہا کہ جو ملک حضور ﷺ کے نام پر بنا، اسے تو دنیا بھر میں ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی حفاظت کا بیڑا اٹھانا چاہیے تھا۔ کتنی شرمناک بات ہے کہ اُس ملک میں تحفظِ ناموسِ رسالت کے قانون کو غیر مؤثر کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا، ہمیں ایسا ملک نہیں چاہیئے جہاں گنبدِ خضرا کے مکین ﷺ کے ناموس کو زک پہنچانے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ اعوان صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں ملک کی سالمیت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ تو اس ملک کی بقا کا ضامن ہے۔ اگر اس قانون کو بے اثر کرنے کی سازش کامیاب ہو گئی تو ملک باقی نہیں رہے گا۔

ناموسِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء

دل میں جو ہے محبتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ
قائم کریں گے حجتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

سرمائے کی طلب ہے، نہ جاہ و جلال کی
دل میں اگر ہے دولتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

ایمان کی اَساس یہی، اصلِ دیں یہی
الفت خدا کی، الفتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

اَسرارِ معرفت کھُلے اس خوش نصیب پر
جس پر کھُلی حقیقتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

حفظِ وطن کو سربکف، سینہ سپر رہیں
یہ بھی تو ہے حفاظتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

قومی زعیم جتنے ہیں، ہیں مجتمع یہاں
اس کا سبب ہے نسبتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

ہے قوم ان کے فہم و تدبّر کی منتظر
جن کو ملی بصیرتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

ہم جان وار سکتے ہیں محمودؔ بے خطر
کرتے ہوئے حفاظتِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ

(مدیرِ نعت کی یہ نظم قومی زعما کانفرنس منعقدہ ۲۳ جون ۱۹۹۹ کے آغاز میں نامور نعت خواں محمد ثناء اللہ بٹ نے پڑھی)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سلسلے میں

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے موضوع پر

ممتاز محقق و مصنف:

راجا رشید محمود
(ایڈیٹر ماہنامہ "نعت" لاہور)

رکن ناموسِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایکشن کمیٹی

کا ماہانہ سلسلہ وار خطاب

افتتاحی اجلاس

قائداعظم لائبریری
باغِ جناح شاہراہِ قائداعظم لاہور

۹ر اگست ۱۹۹۹ء (پیر)
۳ بجے سے ۵ بجے تک

صدارت: چودھری رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ

تلاوتِ قرآن مجید: مولانا محمد الطاف حسین نیازی جامع مسجد عکسِ گنبدِ خضرا ایرمال۔ لاہور

کلماتِ تعارف: نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ
کنوینر ناموسِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایکشن کمیٹی

نعت خوان: محمد ثناء اللہ بٹ۔ سید محمد رضا زیدی

اجلاس ٹھیک ۳ بجے شروع ہوگا اور ٹھیک ۵ بجے ختم ہو جائے گا

انٹرنیشنل سیرت فورم
صدر دفتر: ۳۰۔ میکلیگن روڈ۔ لاہور، فون، ۷۳۲۱۷۱۶
دفترِ رابطہ: جامع مسجد عکسِ گنبدِ خضرا کینال برج ایرمال۔ لاہور، فون: ۵۷۶۱۹۹۶

ماہنامہ "نعت" لاہور

۱۹۸۸ کے خاص نمبر

جنوری	حمدِ باری تعالیٰ
فروری	نعت کیا ہے؟
مارچ	مدینۃ الرسول ﷺ (اوّل)
اپریل	اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (اوّل)
مئی	مدینۃ الرسول ﷺ (دوم)
جون	اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (دوم)
جولائی	نعتِ قدسی
اگست	غیر مسلموں کی نعت (اول)
ستمبر	رسول ﷺ نمبروں کا تعارف (اول)
اکتوبر	میلادُ النبی ﷺ (اوّل)
نومبر	میلادُ النبی ﷺ (دوم)
دسمبر	میلادُ النبی ﷺ (سوم)

۱۹۸۹ کے خاص نمبر

جنوری	لاکھوں سلام (اول)
فروری	رسول ﷺ نمبروں کا تعارف (دوم)
مارچ	معراجُ النبی ﷺ (اول)
اپریل	معراجُ النبی ﷺ (دوم)
مئی	لاکھوں سلام (دوم)
جون	غیر مسلموں کی نعت (دوم)
جولائی	کلامِ ضیاء القادری (اول)
اگست	کلامِ ضیاء القادری (دوم)
ستمبر	اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (سوم)
اکتوبر	درود و سلام (اول)
نومبر	درود و سلام (دوم)
دسمبر	درود و سلام (سوم)

۱۹۹۰ کے خاص نمبر

جنوری	حسن رضا بریلوی کی نعت
فروری	رسول ﷺ نمبروں کا تعارف (سوم)
مارچ	درود و سلام (چہارم)
اپریل	درود و سلام (پنجم)
مئی	درود و سلام (ششم)
جون	غیر مسلموں کی نعت (سوم)
جولائی	اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (چہارم)
اگست	وارثیوں کی نعت
ستمبر	آزاد بیکانیری کی نعت (اول)
اکتوبر	میلادُ النبی ﷺ (چہارم)
نومبر	درود و سلام (ہفتم)
دسمبر	درود و سلام (ہشتم)

۱۹۹۱ کے خاص نمبر

جنوری	شہیدانِ ناموسِ رسالت (اول)
فروری	شہیدانِ ناموسِ رسالت (دوم)
مارچ	شہیدانِ ناموسِ رسالت (سوم)
اپریل	شہیدانِ ناموسِ رسالت (چہارم)
مئی	شہیدانِ ناموسِ رسالت (پنجم)
جون	غریب سہارنپوری کی نعت
جولائی	نعتیہ مسدّس
اگست	فیضانِ رضا
ستمبر	عربی ادب میں ذکرِ میلاد
اکتوبر	سراپائے سرکار ﷺ
نومبر	اقبال کی نعت
دسمبر	حضور ﷺ کا بچپن

۱۹۹۲ کے خاص نمبر

جنوری	نعتیہ رُباعیات
فروری	آزاد بیکانیری کی نعت (دوم)
مارچ	نعت کے سائے میں
اپریل	پیر کے دن کی اہمیت (اول)
مئی	پیر کے دن کی اہمیت (دوم)
جون	پیر کے دن کی اہمیت (سوم)
جولائی	غیر مسلموں کی نعت (چہارم)
اگست	آزاد نعتیہ نظم
ستمبر	سیرتِ منظوم
اکتوبر	سراپائے سرکار (دوم)
نومبر	سفرِ سعادت، منزلِ محبت (اول)
دسمبر	سفرِ سعادت، منزلِ محبت (دوم)

۱۹۹۳ کے خاص نمبر

جنوری	۹۲ (قطعات)
فروری	عربی نعت اور علامہ نبہانی ”
مارچ	ستار وارثی کی نعت گوئی
اپریل	حضور ﷺ اور بچے
مئی	حضور ﷺ کے سیاہ فام رُفقا
جون	زائرِ مدینہ بہزاد لکھنوی کی نعت
جولائی	تسخیرِ عالمین اور رحمۃ للعالمین (اول)
اگست	تسخیرِ عالمین اور رحمۃ للعالمین (دوم)
ستمبر	رسول ﷺ نمبروں کا تعارُف (چہارم)
اکتوبر	نعت ہی نعت
نومبر	یا رسول اللہ ﷺ
دسمبر	حضور ﷺ کی رشتہ دار خواتین

۱۹۹۴ کے خاص نمبر

جنوری	محمد حسین فقیر کی نعت
فروری	نعت ہی نعت (دوم)
مارچ	تضمینیں
اپریل	حضور ﷺ کی معاشی زندگی
مئی	اختر الحامدی کی نعت
جون	مدینۃ الرسول ﷺ (سوم)
جولائی	شیوا بریلوی اور جمیل نظر کی نعت
اگست	دیارِ نور
ستمبر	بے چین رجپوری کی نعت
اکتوبر	نعت ہی نعت (سوم)
نومبر	نور علیٰ نور
دسمبر	معراج النبی ﷺ (سوم)

۱۹۹۵ کے خاص نمبر

جنوری	حضور ﷺ کی عاداتِ کریمہ
فروری	استغاثے
مارچ	نعت ہی نعت (چہارم)
اپریل	نعت کیا ہے؟ (دوم)
مئی	نعت کیا ہے؟ (سوم)
جون	نعت کیا ہے؟ (چہارم)
جولائی	خواتین کی نعت گوئی (اشاعتِ خصوصی)
ستمبر	نعت ہی نعت
اکتوبر	کافی کی نعت
نومبر	غیر مسلموں کی نعت گوئی
دسمبر	انتخابِ نعت

۱۹۹۶ کے خاص نمبر

جنوری	لطف بریلوی کی نعت
فروری	نعت ہی نعت (ششم)
مارچ	(اردو نعتیہ شاعری کا انسائیکلوپیڈیا)
اپریل	" (حصہ اول)
مئی	ہجرتِ مصطفیٰ ﷺ
جون	سرکار ﷺ دی سیرت
جولائی	حضورؐ کیلئے لفظ "آپ" کا استعمال
اگست	ظہورِ قدسی
ستمبر	اردو نعتیہ شاعری کا انسائیکلوپیڈیا
اکتوبر	(حصۂ دوم)
نومبر	مجھے اُن ﷺ سے پیار ہے
دسمبر	ضلع اٹک کے نعت گو

۱۹۹۷ کے خاص نمبر

جنوری	شہرِ کرم (مصطفیٰ ﷺ نگر)
فروری	نعت ہی نعت (ہفتم)
مارچ	ہُوا یہ کہ....
اپریل	جوہر میرٹھی کی نعت
مئی	حضور ﷺ دا وَیریاں نال سلوک
جون	دربارِ رسول ﷺ سے اعزاز یافتہ خواتین
جولائی	احمد رضا بریلوی کی نعت
اگست	مدیحِ سرکار ﷺ
ستمبر	گجرات کے پنجابی نعت گو شعرا
اکتوبر	تہنیت النساء تہنیت کی نعت
نومبر	اردو نعت اور عساکرِ پاکستان
دسمبر	ڈاکٹر فقیر کی نعتیہ شاعری

۱۹۹۸ کے خاص نمبر

جنوری	نزولِ وحی (تحقیق)
فروری	ضلع گجرات کے اردو نعت گو شعرا
مارچ	قطعاتِ نعت
اپریل	نعت ہی نعت (ہشتم)
مئی	ہجرتِ حبشہ (تحقیق)
جون	عبدالقدیر حسرت کی حمد و نعت
جولائی	ماہنامہ "نعت" کے اداریے
اگست ستمبر	نعت اور ضلع سرگودھا کے شعرا
اکتوبر	ماہنامہ "نعت" کے دس سال (اشاعت خصوصی)
نومبر	حی علی الصلوۃ
دسمبر	نعت ہی نعت

۱۹۹۹ کے خاص نمبر

جنوری	کراچی کے شعراءِ نعت
فروری	حقیر فاروقی کی نعت
مارچ	نعتیہ تبرکات
اپریل	سرکار ﷺ دی جنگی زندگی
مئی	مکی زندگی کے مسلمان
جون	حمید صدیقی کی نعت گوئی
جولائی اگست	تحفظِ ناموسِ رسالت (اشاعتِ خصوصی)
ستمبر	مخمساتِ نعت

راجا رشید محمود کی مطبوعات

اردو مجموعہ ہائے نعت

1- ورفعنالک ذکرک 1977, 1998, 1993(صفحات136)
2- حدیثِ شوق (دوسرا مجموعہ نعت) 1982,1984,1986(صفحات176)
3- منشورِ نعت (اردو پنجابی فردیات) 1988(صفحات176)
4- سیرتِ منظوم (بصورت قطعات) 1992(صفحات128)
5- **92** (نعتیہ قطعات) 1993(صفحات112)
6- شہرِ کرم (مدینہ طیبہ کے بارے میں نعتیں) 1996(192صفحات)
7- مدیحِ سرکار ﷺ۔ 1997 (124صفحات)
8- قطعاتِ نعت۔ 1998 (110صفحات)
9- حی علی الصلوۃ۔ 1998 (160صفحات)

پنجابی مجموعہ ہائے نعت

10- نعتاں دی اٹی (صدارتی ایوارڈیافتہ) 1985, 1987(192صفحات)
11- حق دی تائید۔ 1956(صفحات8)

تحقیقِ نعت

12- پاکستان میں نعت۔ 1994 (صفحات224)
13- غیر مسلموں کی نعت گوئی۔ 1994(صفحات400)
14- خواتین کی نعت گوئی۔ 1995(صفحات112)
15- نعت کیا ہے؟ 1995 (صفحات112)
16- اردو نعتیہ شاعری کا انسائیکلوپیڈیا۔اول۔ 1996 (408صفحات)
17- اردو نعتیہ شاعری کا انسائیکلوپیڈیا۔دوم۔ 1997 (400صفحات)

انتخابِ نعت

18- مدیحِ رسول ﷺ۔ 1973(صفحات198)
19- نعتِ خاتم المرسلین ﷺ۔ 1982, 1988, 1993(صفحات276)
20- نعتِ حافظ (حافظ پیلی بھیتی کی نعتوں کا انتخاب) 1987(صفحات276)
21- قُلزمِ رحمت (امیر مینائی کی نعتوں کا انتخاب) 1987(صفحات96)
22- نعتِ کائنات (اصنافِ سُخن کے اعتبار سے ضخیم انتخاب) بسوط تحقیقی مقدمے کے ساتھ۔ جنگ پبلشرز کے زیرِ اہتمام۔ چار رنگا طباعت۔ 1993(صفحات96)
23- ماہنامہ نعت کی اشاعت کے ساڑھے دس برسوں میں بیسیوں موضوعات اور بہت سے شعراء نعت کی نعتوں کا انتخاب راجا رشید محمود نے کیا ہے۔ ماہنامہ نعت اب تک 17,000 (سترہ ہزار) صفحات شائع کر چکا ہے۔

اسلامی موضوعات پر کتابیں

24- احادیث اور معاشرہ۔ 1986, 1987, 1988(بھارت میں بھی چھپی) صفحات192
25- ماں باپ کے حُقوق۔ 1985, 1993 (صفحات112)
26- حمد و نعت (تدوین) 16 مضامین' 49 منظومات۔ 1988(صفحات224)
27- میلادُ النبی ﷺ (تدوین) 16 مضامین' 80 میلادیہ نعتیں۔ 1988 کلکتہ (صفحات112)
28- مدینہ ُالنبی ﷺ (تدوین) 16 مضامین' 57 منظومات۔ 1988(صفحات224)

تاریخ اور تاریخی شخصیات پر کتابیں

29- اقبالؒ و احمد رضاؒ : مدحت گرانِ پیغمبر ﷺ۔ 1977, 1979, 1982(صفحات112)
30- اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور پاکستان۔ 1983, 1987(صفحات160)
31- قائدِ اعظم۔۔۔۔۔افکار و کردار۔ 1985(صفحات160)
32- تحریکِ ہجرت 1920 (تاریخی و تحقیقی تجزیہ) 1982, 1986, 1994(صفحات464

مزید کتابیں

33- نزولِ وحی۔ 1998(132صفحات)
34- میرے سرکار ﷺ۔ 1987(صفحات144)
35- حضور ﷺ اور بچے۔ 1993(صفحات112)
36- تسخیرِ عالمین اور رحمت للعالمین ﷺ۔ 1993(صفحات256)
37- درود و سلام۔ 93, 94, 95, 96, 97, 98, 1999(دس ایڈیشن چھپے) صفحات128
38- قرطاس محبت (حُبِ رسول ﷺ کے مظاہر) 1992 (صفحات144)
39- سفر سعادت' منزلِ محبت (سفرنامہ حجاز) 1992 (صفحات224)
40- راج دُلارے (بچوں کے لئے نظمیں) 1985, 1987, 1991(صفحات96)
41- میلادِ مصطفیٰ ﷺ۔ 1991(صفحات48)
42- عظمتِ تاجدارِ ختمِ نبوت ﷺ۔ 1991(صفحات32)
43- منظومات (نعتیں، مناقب، نظمیں) 1995(صفحات160)
44- دیارِ نور۔ (سفرنامہ حجاز) 1995(صفحات112)
45- حضور ﷺ کی عاداتِ کریمہ۔ 1995(صفحات256)

تراجم

46- الخصائص الکبریٰ۔ جلد اول و دوم (از علامہ سیوطیؒ) 1982
47- فتوح الغیب (از حضرت غوث اعظمؒ) 1983
48- تعبیر الرؤیا (منسوب بہ امام سیرینؒ) 1982
49- نظریہ پاکستان اور نصابی کتب (تدوین و ترجمہ) 1971

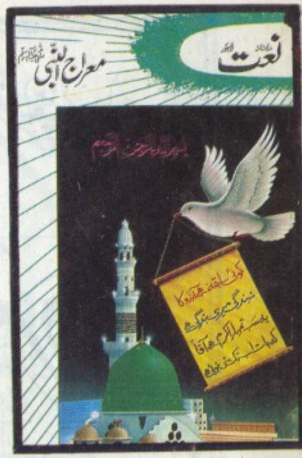


Naunehal
herbal gripe water
نونہال
نباتی گرائپ واٹر
Hamdard

ماہنامہ

نعت

لاہور



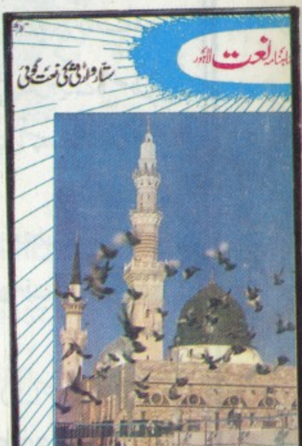


جنوری ۱۹۸۸ سے
باقاعدہ اشاعت

ہر شمارہ ۱۱۲ صفحات

سال میں تین خصوصی اشاعتیں
(چار چار سو صفحات سے زائد)

ہر ماہ چار رنگا
خوبصورت سرورق

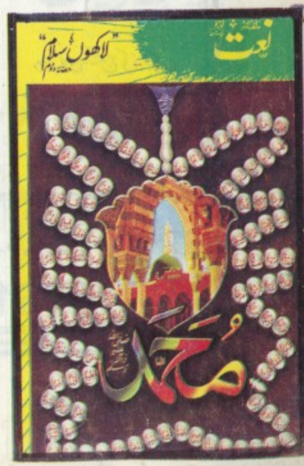




خوبصورت کتابت
اور کمپوزنگ
معیاری طباعت

اب تک
17,000 صفحات
شائع ہو چکے ہیں

فی شمارہ : ۱۵ روپے
اشاعت خصوصی : ۶۰ روپے
زرِ سالانہ : ۲۰۰ روپے





اظہر منزل

نیو شالامار کالونی
ملتان روڈ لاہور۔